اک عمر کے طلسم میں

ہما کوکب بخاری

بار اول ——— ۲۰۱۰ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— ۲۰۰ روپے

ISBN 978-969-517-271-1

اسٹاکسٹ
علم و بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

کوئلے آگ میں جلتے ہوئے
کن یادوں کی کس رات میں
جل جاتے ہیں؟؟؟
کوئلے لاکھوں برس دور کے خوابوں میں اُلجھ جاتے ہیں۔

آتش دان میں جلتے ہوئے کوئلوں سے آگ کی سرخ سرخ لپٹیں نکل رہی تھیں۔ چر چر کی آواز کے ساتھ کبھی کوئی ننھی سی چنگاری اُڑتی اور پھر خاموشی سے وہیں کہیں تحلیل ہو جاتی۔ بالکل میری زندگی کی طرح جس میں ایک چنگاری چر چر کی آواز کے ساتھ اُڑی تھی اور میری ساری زندگی جل کر تباہ ہوگئی تھی۔ میرے تمام خواب ساری اُمنگیں سب خواہشیں راکھ ہوگئی تھیں۔ پھر وہ چنگاری تو وہیں کہیں تحلیل ہوگئی لیکن میں تب سے اب تک راکھ کے اس ڈھیر پر ماتم کناں ہوں۔ باہر نمی بارش ہو رہی ہے لیکن اس راکھ کو آج تک کوئی بارش اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جا سکی۔ ان اکیس سالوں کے طوفان بھی نہیں، ہر طوفان کے بعد ایک گہرا سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک اور طوفان کا پیش خیمہ۔ میں نے ہر طوفان ہر تباہی کا سامنا کیا ہے لیکن اس دفعہ سناٹے کی جھیل میں پڑنے والا پہلا پتھر شاید ایسے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو جو اپنے ساتھ سب کچھ تنکوں کی طرح بہا کر لے جائے۔ راکھ کے وہ سارے ڈھیر اور میرا وجود بھی۔

کھڑکی کے شیشے پر پڑنے والی بوندوں کی ٹناٹن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بارش تیز ہوتی جا رہی ہے۔ میں راکنگ چیئر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ پردہ اٹھا کر باہر جھانکا لیکن وہاں دور دور تک اندھیرے کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی اور بوندوں کے شور کے علاوہ کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے، شاید سبھی سو چکے تھے، میں

پردہ برابر کر کے پھر راکنگ چیئر پر آ بیٹھی۔

سعودی حکومت سے پانچ سالہ معاہدہ ختم کر کے میں چند سال قبل ہی پاکستان واپس پہنچی تھی، اس شہر میں جس سے میں اکیس سالوں سے بھاگ رہی تھی۔ تنہائی کے ان اکیس طویل سالوں کے صحرا میں مَیں سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ یہ جانے اور سوچے بغیر کہ مجھے بالآخر کہاں قیام کرنا ہے اور کہیں کرنا بھی ہے یا نہیں؟ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کس سمت جانا ہے، کس منزل پر رہنا ہے، میری زندگی اس بچے کی سی تھی جو میلے کی بھیڑ میں اپنے ماں باپ اور ہم جولیوں سے بچھڑ جاتا ہے اور پھر سارے میلے میں پاگلوں کی طرح انہیں تلاش کرتا ہے۔ اسے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانیں بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن وہ انہیں حسرت سے دیکھ کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے کیونکہ ہر مٹھائی اور ہر کھلونا اس کی نظروں کے سامنے ہونے کے باوجود اس کی دسترس سے دور ہوتا ہے۔ تہی دامن اور بے آسرا بچہ جس کی منزل گم ہو چکی ہو۔

لیکن یوں سرپٹ بھاگتے بھاگتے میں اتنی تھک گئی تھی کہ اب منزل کا نشان چاہتی تھی، صحرا میں دور بہت دور ایک نخلستان تھا یا شاید یہ صرف میری خوش فہمی تھی اور وہ نخلستان نہیں محض سراب تھا۔ زیادہ ممکن تو یہی تھا کہ وہ ایک سراب ہی تھا لیکن کوئی تو ہو میری منزل۔ نخلستان نہ سہی سراب ہی سہی، اس لیے میں نے زندگی کا پہیہ پیچھے گھمانے کی کوشش کی تھی۔ یوں بھی

''سنا ہے گمشدہ چیزیں
جہاں پہ کھوئی جاتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں''

اور یوں میں بھی اکیس سالوں بعد اپنا ستارہ ڈھونڈنے کے لئے پاکستان واپس چلی آئی۔

''اکیس سال بہت ہوتے ہیں۔'' میں نے نوکری کا تقرر نامہ دیکھ کر سوچا تھا۔ ''اس دنیا میں ایک لمحے میں بھی انقلاب آ جاتے ہیں۔ یہ تو تنہائی اور کرب کے اکیس طویل سال ہیں۔ اب میں وہ پندرہ سالہ سعدیہ نہیں ہوں، چھتیس سال کی تعلیم یافتہ باشعور عورت ہوں۔''

تب یہ سوچتے سوچتے نہ جانے کیسے میں سنگھار میز کے سامنے آ گئی تھی، گھنے سیاہ بالوں میں اب اکا دکا چاندی کے تار اتر آئے تھے، آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ چہرے سے خود اعتمادی

ہویدا تھی، کھلی ہوئی رنگت اور تیکھے نقوش آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی سعدیہ نذر اس پندرہ سالہ زرد رنگت والی سعدیہ نذر سے بالکل مختلف تھی۔ جو ہر وقت بڑی سی چادر میں لپٹی رہتی تھی، جس کی جھکی ہوئی نظریں مسالوں کے ڈبوں پر جمی رہتی تھیں اور ہاتھ مسلسل حرکت میں رہتے تھے۔ کتنے ڈھیر سارے ڈبوں کی پیکنگ کے بعد بھی مزدوری یوں ملتی تھی جیسے بھیک دی جا رہی ہو۔

ہاں اس شہر میں اس سعدیہ نذر کو کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔

لاہور ایئرپورٹ کے رن وے پر جہاز کے پہیوں کے ٹکتے ہی ڈھیر ساری نمی میری آنکھوں میں چلی آئی تھی، میں نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا۔'' میں نے خود کو تسلی دی۔ ''اور اب تو اس شہر کی آبادی اتنی بڑھ چکی ہے، اتنے ہجوم میں کسے اتنی فرصت کہ چہرے دیکھتا پھرے۔ گمشدہ چہرے کس کام کے۔''

اور پھر جب میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سعدیہ نذر کی حیثیت سے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ پہنچی تو ایک ہفتے کی جدوجہد کے بعد میں بالکل پُرسکون تھی۔ میری فکریں اور میرے جذبات اعتدال پر آ چکے تھے۔ اپنی تنہائی اپنے کرب اور اپنی سوچوں کو میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اندر مقید کر لیا تھا۔

لیکن ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تانیا کے ساتھ کوریڈور میں کھڑے ہو کر زور و شور سے بنیادی انسانی حقوق پر بحث کرتے ہوئے عباس شاہ کو دیکھ کر سناٹے کی جھیل میں پہلا پتھر کچھ اس طرح گرا کہ سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ تانیا ریلنگ سے پشت ٹکائے کھڑی تھی اور سیاہ جینز اور سوئیٹر میں ملبوس عباس اظہار خیال کے لئے منہ کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو بھی استعمال کر رہا تھا۔ اور پھر لائبریری میں تانیا کے ساتھ بیٹھ کر کتاب پڑھتا ہوا عباس۔ میں دور سے اسے دیکھ رہی تھی کوئی کلاس فیلو اس کے نزدیک آیا اور جھک کر کوئی بات کرنے لگا۔ عباس نے کتاب پر سے نگاہ اٹھائی۔ انداز So what رویہ Who cares۔ میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس میں اور انیس میں سرِ مو بھی تو فرق نہیں تھا، وہ سر سے پاؤں تک اسی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، قد کاٹھ اور شکل۔ عباس کو دیکھ کر

یوں لگتا تھا جیسے انیس کا دوسرا جنم ہو، اگر میرا جنم درجنم پر یقین ہوتا تو عباس کو دیکھ کر وہ یقین شاید ایمان بن جاتا۔

پر وہ انیس نہیں تھا اس کا بیٹا تھا عباس شاہ، میرے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ نہیں یہ حق صرف عباس کا نہیں تھا مراد کا بھی تھا۔ میرے مراد کا، لیکن مراد کو یہ حق کیسے مل سکتا تھا اسے تو میں نے اس سرد طوفانی رات کے سپرد کر دیا تھا۔ اس رات میرے اندر ایسی آگ لگی تھی جو کبھی سرد نہیں ہوئی میں اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ بالکل گیلی لکڑی کی طرح، جو نہ پوری طرح جلتی ہے نہ ہی پوری طرح سلامت رہتی ہے۔ عباس کو دیکھ کر میرے وجود کے اندر نفرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا اور میں اس سے نکلنے والے لاوے میں سرتا پا غرق ہو چکی تھی اور اب آتش دان کے سامنے بیٹھ کر سلگ رہی تھی۔

''لیکن اب کیا ہوگا؟'' یہ سوال میں خود سے پوچھ پوچھ کر تھک چکی تھی، شاید میری نفرت کی آگ سب کچھ جلا کر راکھ کر دے۔ انیس اور عباس دونوں کو ہی بھسم کر دے، آتش دان میں جلتے بجھتے ہوئے شعلوں کی طرح۔ ویسے ہی جیسے میں نے اتنے بہت سے سال جلتے ہوئے گزارے ہیں۔

میری نگاہیں آتش دان کی طرف اٹھیں جہاں آگ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

''آگ میں کوئلے بجھنے کی تمنا نہ کرو

ان سے آئندہ کے مٹتے ہوئے آثار

اُبھر آئیں گے

ان گزرتے ہوئے لمحات کی تنہائی میں''

میں نے راکھ کرید کر آگ بھڑکا دی۔ کل۔ آئندہ تھی لیکن یہ رات میری اپنی تھی اور ایسی ہر کربناک رات میں نے ماضی میں رہتے ہوئے گزاری تھی۔ تب میں بمشکل پندرہ برس کی تھی، اپنے ابا جی اور ماں جی کی واحد اولاد۔

☆======☆======☆

''بیٹا تمہارا میٹرک کا نتیجہ کب نکل رہا ہے۔'' ابا جی نے رات کے کھانے کے بعد پوچھا۔

''ابھی تو امتحان ختم ہوئے ابا جی، دو ڈھائی مہینے سے کم کیا لگیں گے۔'' میں نے برتن سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ دن جلدی جلدی گزریں تاکہ میں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ سکوں۔ بیمار اور دکھی لوگوں کی مسیحا کے روپ میں۔'' ابا جی نے کہا۔

''میں آپ کی خواہش ضرور پوری کروں گی'' میں برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

''کاش میرا ایک بیٹا ہوتا۔''

کمرے سے نکلتے نکلتے میرے کانوں میں ابا جی کی آواز آئی تو میرے دل میں درد کی ٹیس اٹھی۔

''میں ابا جی کو بیٹا بن کر دکھاؤں گی۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر دل میں عہد دہرایا جو ایسی بات سن کر ہر مرتبہ میں دل ہی دل میں خود سے کیا کرتی تھی۔

ماں جی صبح تڑکے اٹھ جانے کی عادی تھیں۔ ایک تو یہ ان کی بچپن کی عادت تھی اور پھر ابا جی کو بھی فیکٹری جانا ہوتا تھا۔ میں امتحانوں سے فارغ ہو چکی تھی اس لئے دیر تک سوتی رہتی تھی۔ اس صبح بھی میں ابھی سوئی ہوئی تھی کہ کچھ غیر مانوس سی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔

''ساتھ والوں کے گھر پر کوئی جھگڑا ہو گیا ہوگا۔'' میں نے سوچا اور کروٹ بدل لی لیکن شور لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا اور پھر جب اس میں ماں جی کے بَین شامل ہو گئے تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ مجھے تو حواس درست کرنے کا بھی موقع نہ ملا، ماں جی کا رونا سن کر میں ننگے سر، ننگے پیر کمرے سے نکل آئی۔ صحن محلے کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور ماں جی ان کے بیچ میں گھری کھڑی تھیں۔ کچھ عورتیں انہیں تسلیاں دے رہی تھیں، کچھ با آواز بلند اظہار ہمدردی کر رہی تھیں اور کچھ اُچک اُچک کر ایک دوسرے کے کندھے کے اوپر سے محض تماشا دیکھ رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں بھاگ کر صحن میں پہنچی۔ ''ماں جی کیا ہوا کچھ تو بولیں۔'' میں نے انہیں جھنجوڑا۔

''فیکٹری میں کام کرتے ہوئے تمہارے ابا جی کے اوپر لوہے کا بھاری راڈ گر گیا ہے۔'' فخرو کی ماں بولی۔ ''ہسپتال لے گئے ہیں انہیں' فخرو کے ابا خبر لے کر آئے تھے، کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹروں کو امید نہیں ہے ان کے بچنے کی۔''

''کیا؟'' میں سکتے کے عالم میں رہ گئی۔

''ہاں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر کسی صورت بچ گئے تب بھی تمام عمر کے لئے چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں گے۔''

''بھلے معذور ہو جائیں زندہ تو ہوں گے'' ماں جی نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہئے سوائے ان کی زندگی کے، ساری عمر خدمت کروں گی ان کی۔ بس میری بچی کے سر پر ان کا سایہ سلامت رہے اور کچھ نہیں چاہئے مجھے۔'' ماں جی پھر اوڑھنی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رو دیں۔

''یہاں بیٹھ کر رونے سے کچھ نہیں ہوگا ماں جی۔'' تھوڑی دیر بعد میرے حواس درست ہوئے تو میں نے سر اٹھایا۔ ''انھیں ہمیں ہسپتال جانا ہے''۔

ماں جی کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں نے فخرو کو رکشہ لینے کے لئے دوڑایا اور خود چادر لینے اندر چلی گئی۔

''ابھی کل رات ابا جی یہیں میرے اور ماں جی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے اور اس وقت وہ ہسپتال کے کسی بستر پر بے یار و مددگار پڑے ہوں گے۔'' میں نے سوچا تو میرے دل میں درد کی ایک لہر دوڑتی چلی گئی۔

''ابا جی اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر نہ جانا، ابھی تو میں نے آپ کے پیار اور محبت کا ذائقہ بھی پوری طرح نہیں چکھا۔'' میرا دل بھر آیا۔ ''یوں اپنی بیٹی کو بے یار و مددگار زمانے کے سمندر میں نہ پھینکیں۔ ابھی تو ابا جی میں نے آپ کے خوابوں کو پورا کرنا ہے۔ اگر آپ چلے گئے تو کون مجھ سے سکول کالج کے قصے سنے گا؟ کون فکرمند ہوگا میری پڑھائی کے لئے؟ کون مجھے خود سے کیا ہوا عہد یاد دلائے گا؟ نہیں ابا جی اتنی جلدی نہیں۔'' میں بلک بلک کر رو پڑی۔

''باجی چاچی بلا رہی ہیں۔'' فخرو نے کمرے میں جھانکا۔ ''میں رکشہ لے آیا ہوں۔''

''تم چلو میں آتی ہوں۔'' میں نے چادر سے آنسو صاف کئے اور تکیے کے نیچے سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر چادر کے پلو میں باندھ دیا۔ یہ پیسے دو دن قبل ابا جی نے بہت پیار سے مجھے دیئے تھے تاکہ میں اپنے لئے کپڑے بنا سکوں۔

''سعدیہ!'' باہر سے ماں جی کی آواز آئی۔

''ابھی آئی۔'' کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل آئی۔ ''چلیں۔''

رکشہ میو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ پہنچا تو میں ماں جی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اندر کی جانب لپکی۔ وہاں ہر طرف ہجوم اور افراتفری تھی۔ ہر ایک تیزی میں تھا، سبھی اپنی اپنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ہم ابا جی تک پہنچے، جو ایک میلی سی چادر میں بستر پر پٹیوں سے جکڑے پڑے تھے۔

''ابا جی!'' میں تیزی سے آگے بڑھی۔ ''ابا جی۔''

انہوں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ ماں جی کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''سعدیہ بیٹا ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ ان کے گھر سے کوئی آئے تو فوراً آ کر ملے۔'' فخرو کے ابا بولے جو وہیں کھڑے تھے۔

''کہاں ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' میں جانتی تھی کہ اس وقت اپنے حواس پر قابو رکھنا بہت ضروری ہے۔

''چلو میرے ساتھ۔'' وہ مجھے اپنے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف لے گئے۔

''آپ کے والد کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''ایک بازو اور ٹانگ کی ہڈیاں بھی ٹوٹی ہیں، فوری طور پر جو ہم سے ہو سکا وہ ہم نے کیا ہے لیکن انہیں بہت لمبے علاج کی ضرورت ہے۔ یہاں ایک تو بستروں کی کمی ہے پھر اتنے مریض ہیں کہ کسی پر بھی بطور خاص توجہ نہیں دی جا سکتی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں انہیں اپنے کلینک میں شفٹ کر دیتا ہوں، وہاں ان کی دیکھ بھال بہتر انداز میں ہو سکے گی۔''

''کلینک میں۔'' میں بجھ سی گئی کیونکہ جانتی تھی کہ پرائیویٹ علاج خاصا مہنگا ہوتا ہے۔

''خرچا کتنا ہوگا وہاں؟''

''خرچا تو کافی زیادہ ہوگا کیونکہ ایک تو ہم وہاں مریضوں کو اچھا ماحول دیتے ہیں اور پھر توجہ بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن اصلی خرچ دواؤں کا ہے ان کی دوائیں بہت مہنگی آئیں گی۔''

''دوائیں مہنگی ہیں تو آپ نہیں دے سکتے۔ بستروں کی کمی ہے تو پھر کاہے کو حکومت نے سرکاری ہسپتال کھول رکھے ہیں؟ ہم غریب کہاں جائیں جن کے گھر میں فالتو کا ایک پیسہ بھی

نہیں نکل سکتا؟''

''اب آپ کے پاس فالتو پیسے ہیں یا نہیں یہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کندھے اچکائے۔ ''میں نے آپ کو صورتِ حال بتادی ہے اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ کیا فیصلہ کرتی ہیں۔ اگر آپ کے والد ساری زندگی کے لئے معذور ہو گئے تو اس کی ذمہ داری ہم میں سے کسی پر عائد نہیں ہوگی۔''

''معذور!'' میں زیر لب بڑبڑائی۔

انسان بھی کتنی عجیب چیز ہے، تھوڑی دیر پہلے تک میں اللہ تعالیٰ سے ابا جی کے زندہ بچ جانے کی دعا کر رہی تھی۔ چاہے وہ معذور ہی ہوں لیکن زندہ سلامت ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں اور اب جبکہ ان کی زندگی کی امید ہو چکی تھی تو مجھے ان کی معذوری بھی گوارہ نہیں تھی۔

''آپ حساب لگا کر بتائیں کتنا خرچا ہوگا؟'' میں نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

''دس سے پندرہ ہزار روپے۔''

''دس سے پندرہ ہزار؟'' میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''لیکن یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ ہم نے اتنے روپے کبھی خواب میں بھی اکٹھے نہیں دیکھے۔''

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھے بغیر کندھے اچکائے اور سامنے رکھے ایکسرے کا معائنہ کرنے لگا۔

''کیا کچھ کمی نہیں ہو سکتی؟'' مجھے ڈاکٹر کی بے نیازی پر اس قدر غصہ آرہا تھا کہ سامنے پڑا پیپر ویٹ اٹھا کر اس کے سر پر مارنے کو دل چاہ رہا تھا۔

''بی بی میں نے جس حد تک ممکن تھا کاٹ چھانٹ کر آپ کو بتایا ہے لیکن کلینک بہرحال کلینک ہوتا ہے، خیراتی ہسپتال نہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب کھال کھینچیں لیکن ان مریضوں کی جن کی کھال موٹی ہو۔ ان کی نہیں جن کی ہڈیوں پر صرف چمڑا منڈھا ہو، جو نہ دھوپ کی شدت سے بچا سکتا ہو اور نہ سرد کٹیلی ہواؤں سے۔ کچھ تو خیال کریں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ اور بہت سے لوگوں سے کما لیں گے، لیکن ایک مریض سے رعایت کر کے آپ کی ہمدردی سے مجھے میرا باپ واپس مل

جائے گا۔ پلیز ڈاکٹر صاحب۔'' میرا آواز بھرا گئی۔

''بی بی یہ جو آپ کو باہر چلتے پھرتے لوگ نظر آرہے ہیں یہ سب ہی مستحق ہیں اور وہ جو موٹی کھال والے ہیں، وہ یہاں نہیں آتے سیدھا کلینک پہنچ جاتے ہیں۔ کتنوں کے ساتھ رعایت کریں گے ہم۔ میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا، آپ مرضی کی مالک ہیں جو چاہیں کریں۔ علاج تو یہاں بھی ہوگا، دوائیں آپ کو ہی خریدنی ہوں گی لیکن یہاں میں کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔''

بے بسی سے میری آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

''ڈاکٹر صاحب سچ مچ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو کیا میں اپنے ابا جی کے لئے آپ سے یوں بھیک مانگتی پھرتی۔'' میں رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

ڈاکٹر نے اسٹیتھ سکوپ اٹھایا اور میری طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی مردہ قدموں سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''ماں جی!'' میں نے آہستہ سے انہیں آواز دی، جو ابا جی کے سرہانے کھڑی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

''ماں جی آپ کے پاس پیسے ہیں؟''

''ہاں یہ دو سو روپے ہیں'' انہوں نے اپنا چھوٹا سا بٹوا میری جانب بڑھایا۔

''صرف دو سو روپے؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''کہیں سے قرض مل سکتا ہے یا آپ نے ہی کچھ جمع کر رکھا ہو؟''

''جمع کیسے کر سکتی ہوں؟'' ماں جی بولیں۔ ''ٹھیک ہے ہم نے کبھی فاقے نہیں کئے لیکن مہینے کی آخری تاریخوں میں جیسے میں گزارا کرتی ہوں وہ مجھے ہی معلوم ہے۔ ایک مہینہ ہی اچھے طریقے سے گزر جائے تو غنیمت ہے، بچانا تو ممکن ہی نہیں۔''

''کہیں سے قرض بھی نہیں مل سکتا؟''

''کون دے گا قرض؟'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''سبھی رشتہ دار سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ تمہارے دونوں ماموں ہیں تو وہ عیالدار ہیں، ان سے تو اپنے بچوں کی پوری کرنی مشکل ہے ہمیں کیا قرض دیں گے۔ رہ گئے وہ تمہارے تائے چاچے تو وہ ہمیں پوچھتے

ہی کب ہیں۔"

مایوسی کی شدید لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں وہیں ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا ہے؟"

"اس نے تو ہمیں بہت لمبا نسخہ بتایا ہے۔ اتنے روپے بتائے ہیں جن تک ہمارے خیال کی بھی رسائی نہیں ہے۔"

"فخرو کا باپ کہہ رہا تھا کہ فیکٹری والے بھی کچھ مدد کریں گے۔" ماں نے امید کا چراغ روشن کیا۔

"کتنے روپے دیں گے؟" میں نے جلدی میں پوچھا۔

"شاید پانچ ہزار تک دے دیں۔" انہوں نے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ اس سے گزارا ہو جائے گا۔"

"گزارا۔" میں استہزائیہ انداز سے ہنسی۔ "ہاں اس حد تک گزار ہو جائے گا کہ ابا جی کی سانس کی ڈور بندھی رہے گی، لیکن نہ تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر سکیں گے اور نہ ہی مجھے بازوؤں میں لے کر پیار کر سکیں گے۔" میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ "نہ میرے ساتھ روز رات کو سیر کر سکیں گے اور نہ ہی مجھے بازار لے جا سکیں گے، ماں جی کچھ کریں۔" میں ان کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

"سعدیہ بیٹا تم تو بہت بہادر ہو۔ تمہیں تو اپنی ماں جی کو حوصلہ دینا چاہئے۔ یہ کیا کہ تم ہی رو رہی ہو۔" فخرو کے ابا بولے۔

"چاچا جی آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟"

"اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبیل نکالے گا، میں مالکوں سے کہوں گا کہ انہیں فیکٹری کے مزدوروں کا خیال رکھنا چاہئے۔ دیکھو شاید کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے۔"

"چاچا جی!" میں نے اپنے کانوں میں پڑی ہوئی سونے کی بالیاں اتار کر ان کی طرف بڑھائیں۔ "یہ بھی بیچ دینا۔"

"توبہ کر بیٹا تو" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "گھر کا سونا کبھی فروخت نہیں

کرتے۔"

"یہ سونا چاندی میرے باپ کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔" میں چڑ گئی۔

"ابھی انہیں اپنے پاس ہی رکھو ضرورت پڑی تو بعد میں دیکھا جائے گا۔" وہ اب بھی راضی نہیں تھے۔

"اس کی ضرورت پڑے گی ہی۔" میں نے بالیاں زبردستی ان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

ماں نے بھی اپنے کانوں کی بالیاں اتار کر مجھے پکڑا دیں، کوئی اور زیور ان کے پاس تھا ہی نہیں۔

"چاچا مالکوں سے کہیں کہ ہمیں جلد از جلد پیسوں کی ضرورت ہے۔"

"میں کہوں گا۔" فخرو کے ابا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایمرجنسی وارڈ سے باہر نکل گئے۔

"تمہیں ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔" سفید کپڑوں میں ملبوس ایک موٹی سی نرس نے مجھے دور سے ہی آواز دی۔

"شاید اس ڈاکٹر کے دل میں کچھ ہمدردی جاگ گئی ہو۔" یہ سوچ کر میں تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے آفس میں پہنچی۔

"جی ڈاکٹر صاحب!" میرے لہجے میں امید تھی۔

"یہ دوائیں منگوا لیں۔" اس نے ایک پرچی میری جانب بڑھائی۔ "باہر میڈیکل سٹور سے مل جائیں گی۔"

میری امید پل بھر میں دم توڑ گئی۔

"جلدی لے آئیں اور ہاں خون کا بھی انتظام کر رکھیں۔ ہمیں آپریشن کرنا ہوگا ویسے بھی آپ لوگ مریض کو تب لاتے ہیں جب اس کا آخری وقت نزدیک ہوتا ہے۔ پہلے ہی بہت خون ضائع ہو گیا ہے جلدی کریں ناں میرا منہ کیا دیکھ رہی ہیں۔"

"جی!" میں گڑبڑا کر مڑی اور ماں جی کو بتا کر میڈیکل سٹور سے مطلوبہ دوائیں لے آئی۔ لفافے سے دوائیں نکالتے ہوئے گلوکوز کی بوتل پر میری نگاہ پڑی۔

میرا دماغ گھوم گیا۔

''بہت بے غیرت لوگ ہیں۔'' میں غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ ''دیکھ رہی ہیں آپ۔'' میں نے بوتل ماں جی کی طرف بڑھائی لیکن وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں کیا سمجھتیں۔

''یہ ہسپتال والوں کو مفت ملتی ہیں جو یہ باہر بیچ دیتے ہیں۔'' میں نے انہیں اس غرض سے بتایا کہ میرے غصے کو کچھ سہارا مل سکے۔ ''یہ میں نے اس ڈاکٹر کے سر پر مار کر آنی ہیں۔''

''نہ نہ سعدیہ!'' ماں جی ہول اٹھیں۔ ''یہ مت کرنا بیٹی ہم تو یوں بھی ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ کوئی جھگڑا کیا تو بستر ہی نہ خالی کروالیں۔ پھر کہاں لے کر جائیں گے تمہارے ابا جی کو ہم۔''

میرا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسی نرس نے آواز لگائی۔

''او لڑکی۔''

''مجھے بلایا ہے؟''

''تو اور کسے آوازیں دے رہی ہوں۔''

میں اس کے قریب پہنچی۔

''ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ تازہ خون چاہئے مریض کے لئے بی پازیٹو گروپ کا۔''

''بلڈ بینک کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بلڈ بینک سے یونہی نہیں مل جاتا خون، تم لوگوں کو خود کوئی انتظام کرنا ہوگا۔''

''خون دینا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ بتادیں کہ اس کام کے لئے جانا کہاں ہوگا؟''

نرس نے وہیں کھڑے کھڑے جگہ بتائی۔ مجھے کسی صورت دیر گوارا نہیں تھی، اس لئے اس کی بتائی ہوئی جگہ ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ میرا اپنا خون کا گروپ بھی بی پازیٹو تھا، اس لئے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ خدا خدا کرکے ابا جی کا آپریشن ہوا، کچھ محلے والوں نے مدد کی۔ کچھ فیکٹری سے روپے مل گئے لیکن کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہاتھ میں آئے اور کب نکلے۔

جس دن ہم ابا جی کو گھر لائے، اس دن گھر میں صرف ایک وقت کا آٹا تھا۔

''اب کیا ہوگا سعدیہ؟'' ماں جی باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

''اب۔'' یہی میں سوچ رہی تھی۔

''تمہارے ابا جی تو پتا نہیں کب چلنے پھرنے کے لائق ہوں گے اور نہ جانے ہوں گے بھی یا نہیں، کیسے چلے گی گھر کی دال روٹی۔''

''آج کا تو گزارا کریں آگے کے لئے کچھ سوچتی ہوں۔''

''کیا کروں اب؟'' میں سوچ رہی تھی۔ ''گھر کا خرچا، ابا کی دوائیں، مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور میری تعلیم، کیسے گزارا ہوگا؟'' میں نے سر پکڑ لیا۔ ''ایک ہی راستہ ہے اب تو۔ اپنے سارے خواب بھول کر کہیں نوکری کرلوں۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت۔''

اور رات کے کھانے کے بعد جب میں نے ابا جی سے ذکر کیا کہ میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''تمہیں گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یونہی کھاٹ پر پڑا رہوں گا؟ میں نے بھی کچھ سوچا ہوا ہے تم بے فکر ہو جاؤ اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔''

میں نے ابا جی سے اس وقت یہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ انہوں نے کیا سوچ رکھا ہے۔ پھر اگلے دن تایا برکت کی آمد کے ساتھ ہی مجھے علم ہوگیا کہ ابا جی کیا چاہتے تھے۔

''بھائی جان اب پتا نہیں چلنے پھرنے والا کام کر بھی سکتا ہوں یا نہیں۔'' میں چائے لائی تو ابا جی ان سے کہہ رہے تھے۔ ''سوچ رہا ہوں اگر کہیں سے قرضِ حسنہ مل جائے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان ڈال لوں بس دو وقت کی دال روٹی مل جائے۔''

تائی جان کے ماتھے پر پڑے ہوئے بل مزید نمایاں ہوگئے۔ ''قرضِ حسنہ کی کیا ضرورت ہے جو اتنا پیسہ فیکٹری سے ملا ہے اسی سے دکان ڈال لیں۔''

''وہ سارا تو بیماری پر اٹھ گیا ہے۔''

''کمال ہے آپ نے کون سا پرائیویٹ علاج کروایا ہے، سرکاری ہسپتال میں کب لمبا چوڑا خرچ ہوتا ہے۔''

'بھابی جی ساری دوائیں خریدنی پڑتی ہیں، ہمیں تو خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب پیسہ ہاتھ میں آیا اور کیسے ہاتھ سے نکلا۔''

''ہاں مہنگائی ہی اتنی ہے۔'' تائی جان نے پینترا بدلا۔ ''اب ہمیں ہی دیکھ لیں، محدود

سی تنخواہ ہے، اسی میں چار بچے پڑھ رہے ہیں۔ مجال ہے جو ایک پیسے کی بھی بچت کرسکیں، اِدھر ہاتھ میں آتا ہے اُدھر نکل جاتا ہے۔"

"ہاں میں تو حیران ہوں کیسے گزارا ہوگا، اب تو سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔" تایا جان نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "کوئی آسان ہے بچوں کو تعلیم دلوانا، پڑھائیں تو کھانا مشکل ہوجاتا ہے۔ کھانے پر توجہ دیں تو تن ڈھانکنا مصیبت، کس کس چیز کو پورا کریں۔ اپنے عرفان کو ہی دیکھ لیں، میڈیکل کالج کا اتنا زیادہ خرچ ہے، کچھ سمجھ نہیں آتی کہ کہاں سے پورا کروں۔"

عرفان کا ذکر آتے ہی اباجی کی پرانی امید ایک بار پھر تازہ ہوگئی اور انہوں نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں وہاں سے اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ تائی جی کی آنکھوں میں ناگواری کی واضح جھلک محسوس کرکے میں وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ وہاں کھڑکی کی اوٹ سے میں سب کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

"مجھے سب سے زیادہ فکر سعدیہ کی ہے۔"

"ظاہر ہے انسان کو اولاد کی ہی فکر ہوتی ہے۔" تایا جان بے توجہی سے بولے۔

"آج تک یہ بات زبان پر لاتے ہوئے میں جھجک جاتا تھا لیکن آج میں بہت مجبور ہوں بھائی جان۔" اباجی کہہ رہے تھے۔ "آپ میرے بڑے بھائی ہیں آپ تو محسوس کرسکتے ہیں ناں کہ بیٹی کی ذمہ داری کتنی بڑی ہوتی ہے، اب میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔"

"آپ رشتہ ڈھونڈ لیں ہم سے بساط بھر جو ہوسکا ہم بھی جہیز کے لئے مدد کریں گے۔"

"گھر سے باہر کیا رشتہ ڈھونڈنا جب گھر میں رشتہ موجود ہے۔" اباجی نے ہمت کرکے کہہ ہی دیا۔

"گھر میں کون سا رشتہ موجود ہے؟" تائی جی نے برہمی سے کہا۔ "اگر آپ کا خیال عرفان کی طرف ہے تو بھول جائیں اسے۔ وہ ابھی پڑھ رہا ہے اور کم از کم چھ سال تک ہمارا اس کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"بھابی جان آپ میری مجبوری تو دیکھیں۔" اباجی نے دھیمے لہجے میں کمزور سا احتجاج

کیا۔

"آپ بھی تو ہماری مجبوری دیکھیں۔ میری بھی دو بیٹیاں ہیں مجھے ان کا بھی خیال کرنا ہے۔ جب تک ان کی شادی نہیں ہوجاتی میرے کسی بیٹے کی شادی نہیں ہوسکتی۔ ہم چھ افراد کا اس مہنگائی کے دور میں گزارا مشکل ہے آپ کی بیٹی کو کہاں سے کھلائیں پہنائیں گے۔ پھر بچے ہوگئے تو ان کا پیٹ بھرنا بھی ہماری ذمہ داری بن جائے گا۔ نہ بھائی جی نہ ابھی ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ ان بکھیڑوں میں پڑسکیں۔ آپ عرفان کا انتظار نہ کریں جہاں رشتہ ملتا ہے بات پکی کردیں سعدیہ کی، جہیز وغیرہ میں ہم کچھ مدد کردیں گے۔"

اباجی کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔ دو دن اور اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ اب کیا ہوگا گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی، رشتہ داروں نے ملنا ملانا چھوڑ دیا۔ اباجی سارا وقت گم صم رہتے تھے، ماں جی تو یوں بھی صابر و شاکر تھیں۔ ان دنوں فخرو کے ماں باپ نے ہماری بہت مدد کی، جب وہ لوگ ہمارے لئے دوپہر کا کھانا لے کر آئے تو میں شرم سے پانی پانی ہوگئی۔

"چاچا جی اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت تھی بیٹا۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔ "انسان پر اچھا برا وقت آتا ہی رہتا ہے، ہمیں ضرورت پڑتی تھی تو تم لوگ ہی مدد کرتے تھے ناں۔"

"کب تک چاچا جی؟ کب تک آپ یونہی ہماری مدد کریں گے؟ آپ کون سے امیر ہیں ہماری طرح ہی تو ہیں۔"

"مجھ سے جس حد تک ہوا میں مدد کرتا رہوں گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ روز روز میرے لئے بھی یہ مشکل ہوگا اس لیے سوچتا ہوں کہ کوئی مستقل بندوبست ہوجائے۔" وہ بولے "نذر حسین کا کوئی بیٹا ہوتا تو اسی فیکٹری میں ملازم کروادیتا لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں ہے۔"

"چاچا عورتیں بھی تو نوکری کرتی ہیں کیا مجھے کہیں ملازمت نہیں مل سکتی؟"

"ایک ملازمت ہے تو سہی میری نظر میں۔" انہوں نے اجازت طلب نظروں سے اباجی کی طرف دیکھا۔

"سعدیہ تمہیں ضرورت نہیں ہے ملازمت کرنے کی اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ سبب ضرور پیدا کرے گا۔" اباجی بولے۔

''سب زمین پر ہی بنتے ہیں ابا جی۔ اللہ تعالیٰ بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے بھائیوں کو آپ پر ترس آ جائے گا تو آپ غلطی پر ہیں۔ تین دن سے کوئی یہ بھی دیکھنے نہیں آیا کہ آپ کس حال میں ہیں۔ کب تک خود کو فریب دیتے رہیں گے آپ؟'' پھر میں فخرو کے ابا کی طرف مڑی۔ ''چاچا آپ بتائیں کون سی ملازمت ہے آپ کی نظر میں؟''

''کوئی بڑی ملازمت تو نہیں ہے۔'' وہ متذبذب انداز میں بولے۔ ''مسالا بنانے والی فیکٹری میں پیکنگ کے لئے لڑکیوں کی ضرورت ہے، پیسے تو زیادہ نہیں ہیں لیکن فوری طور پر اس کے علاوہ کچھ ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اگر تم ساتھ ساتھ ٹائپنگ سیکھ لو تو کہیں بہتر ملازمت کی امید کی جا سکتی ہے۔''

وہ لوگ کھانے کے برتن لے کر چلے گئے اور میں ابا جی کی پائنتی کی جانب بیٹھ گئی۔

''ابا جی مجھے اجازت چاہیے ملازمت کی۔''

''میرا دل نہیں مانتا۔'' انہوں نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔

''ابا جی اپنا دل بڑا کریں، قدرت نے ہمیں آزمائش میں ڈالا ہے تو ہم بھی میدان نہیں چھوڑیں گے۔'' میں نے ان کے ساتھ ساتھ خود کو بھی حوصلہ دیا۔ ''آپ چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں تب بھی تو میں ملازمت کرتی۔''

''تب کی بات اور تھی ابھی تو تم بالکل بچی ہو۔'' ڈاکٹروں کو لوگ جھک کر سلام کرتے ہیں، یہاں چھوٹی سی ملازمت میں نہ جانے لوگ تم سے کیا سلوک کریں، ڈانٹیں ڈپٹیں تو پھر کیا ہوگا۔''

''ابا جی ڈاکٹروں کو ہم جیسے غریب لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں جنہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ صحیح بات پر بھی جھگڑنے کی صورت میں مصیبت کا پھندا ہمارے ہی گلے میں پڑے گا۔ جو امیر ہیں اور پیسے لگا کر کلینکوں میں علاج کرواتے ہیں وہ ڈاکٹروں کو جوتے بھی لگاتے ہیں اور علاج بھی پورا کرتے ہیں۔ ہم اتنے نیچے کھڑے ہیں ابا جی کہ ہمیں اپنے سے ایک سیڑھی اوپر بھی جو دکھائی دیتا ہے ہم اسے آسمان کی بلندیوں میں چاند ستاروں کے ساتھ ٹکا کر اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں اور پھر میری جدوجہد یہاں پر ختم تو نہیں ہوگی۔ میرا وعدہ ہے ابا جی

کہ میں آپ کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔''

''مجھے سوچنے دو۔'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھے۔

میرے خیال میں تو سوچنا بیکار ہی تھا۔ گھر میں پینے کے نام پر پانی اور کھانے کے نام پر ہوا کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ابا جی کی دوائیں تک ختم ہو چکی تھیں، پھر بھی میں اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر نکالنے کے حق میں نہیں تھی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ ابا جی کس من وسلویٰ کے انتظار میں ہیں جو کھاٹ پر لیٹے ہوئے یوں آسمان کو تکتے رہتے ہیں۔ اور ماں جی نے تو شکایت کرنا سیکھا ہی نہیں تھا، وہ سارا دن ابا جی کے پاس پیڑھی پر بیٹھی رہتیں۔ انہیں پنکھا جھلتیں یا سر دبانے لگتیں اور میں پریشان حال دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر میں ادھر سے اُدھر پھرتی رہتی۔ تین دن کے فاقوں کے بعد بھائیوں کی طرف سے جو تھوڑی بہت امید ابا جی نے باندھ رکھی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

''سعدیہ!'' انہوں نے کمزور سی آواز میں مجھے پکارا۔

''جی!'' میں ان کے قریب چلی آئی۔

''اپنے چاچے سے کہنا وہ کل تمہیں ملازمت والی جگہ لے جائیں۔'' بالآخر انہوں نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

''میری اتنی چھوٹی سی بچی پر کیا وقت آ پڑا ہے۔'' ماں جی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اسے تو زمانے کی بھی خبر نہیں۔''

فخرو کے ابا نے اگلے روز فیکٹری سے آدھے دن کی چھٹی لی اور مجھے ملازمت دلوانے لے گئے۔ گھر سے یوں باہر نکلتے ہوئے میرا دل دھڑک رہا تھا، اس سے پہلے تو میں بے فکری کے ساتھ سکول جایا کرتی تھی۔ عملی دنیا کیسی ہوتی ہے اس کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی، لیکن وہاں بے شمار لڑکیوں کو اسی کام میں مصروف دیکھ کر میرے دل کو کافی تسلی ہوئی۔

''پندرہ روپے روز کے ملا کریں گے۔'' سپروائزر نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر کہا۔

''جی اچھا۔'' اس وقت پندرہ روپے مجھے کسی نعمت سے کم نہیں لگتے تھے۔

کام کچھ مشکل نہیں تھا لیکن بے حد غیر دلچسپ اور بور تھا۔ مشینی قسم کے کام مجھے بالکل

پسند نہیں تھے۔ جس میں ہاتھ ایک مخصوص مشینی انداز میں ملتے رہیں اور دل و دماغ ان سے دور کہیں آرام کرتے رہیں لیکن مجبوری کا نام شکریہ سمجھتے ہوئے میں کام میں لگی رہی۔ شام کو چھٹی کے وقت دیہاڑی لینے کے لئے میں اور لڑکیوں کے ساتھ لائن میں کھڑی ہوئی تھی۔

''بشیراں، رمضان بیگم، زبیدہ، شمیم، شمشاد'' سپروائزر رجسٹر سامنے رکھے ایک ایک کام کرنے والی لڑکیوں کے نام لیتا اور وہ انگوٹھا لگا کر یا دستخط کر کے اپنی اجرت وصول کر کے سلام کرتی ہوئی دروازے سے باہر نکلتی رہیں۔

''سعدیہ'' اس نے آواز لگائی۔

میں آگے بڑھی۔

''یہاں انگوٹھا لگادو۔''

''میں دستخط کروں گی۔''

اس نے کان میں اُڑسا ہوا بال پین میری طرف بڑھایا، دستخط کر کے میں نے متوقع نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے صندوقچہ نکال کر دس روپے میری جانب بڑھائے۔

''پروین!'' اس نے میری جانب دیکھے بغیر ہانک لگائی۔

''آپ نے مجھے پیسے کم دیئے ہیں۔'' میری آنکھیں دس روپے کے نوٹ سے اٹھ کر اب اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''کیا؟'' اس نے استعجاب سے میری طرف دیکھا۔

''آپ نے صرف دس روپے دیئے ہیں۔'' میں نے نوٹ اس کے سامنے کیا۔

''تو کیا سو روپے ملنے تھے تمہیں؟'' وہ اپنی بات پر خود ہی دانت نکالنے لگا۔

میرا دل تو چاہا کہ اس کی بتیسی اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں لیکن خود پر بہت ضبط کر کے نرمی سے بولی۔ ''آپ نے صبح پندرہ روپے بتائے تھے اور ابھی دستخط بھی اسی پر کروائے ہیں۔''

''پڑھی لکھی لڑکیوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور زبان لمبی ہو جاتی ہے۔'' اب وہ سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ ''یہاں تو تمہیں یہی دس روپے ملیں گے وارا کھائے

تو کام کرو نہیں تو اپنا راستہ ناپو۔''

میں نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور دروازے کی طرف چل دی۔ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اگر مجھے اتنی شدت سے پیسوں کی ضرورت نہ ہوتی تو میں اس ملازمت اور سپروائزر دونوں کو لات مار کر وہاں سے چلی آتی لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

''یہ دماغ خراب ہونے والا مسئلہ صرف پڑھی لکھی لڑکیوں کے ساتھ نہیں ہے۔ ہر اس شخص کا دماغ خراب ہو جاتا ہے جس سے ناانصافی کی جارہی ہو۔'' بس سٹاپ کی طرف جاتے ہوئے میں جلے دل کے ساتھ دل ہی دل میں بولتی جارہی تھی۔ ''لعنت ہو اس سپروائزر پر اللہ کرے اسے ہضم نہ ہوں یہ میری محنت کے پیسے۔ حرام کھا کھا کر پیٹ باہر نکلا جارہا ہے جب گوشت کے اس پہاڑ کو قبر میں کیڑے کھائیں گے تب پتا لگے گا۔ کہتا ہے دماغ خراب ہو جاتا ہے زبان لمبی ہو جاتی ہے، ہاں دماغ تو خراب ہو گیا ہے کاش زبان لمبی ہوتی تاکہ اس کا دماغ درست کر دیتی۔''

ماں جی کے ہاتھ میں پیسے پکڑا کر میں اندر کمرے میں گھس گئی۔

''خیریت تو رہی بیٹا؟'' ماں جی میرا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر فوراً بھانپ جاتی تھیں۔

''جی خیریت ہی ہے۔''

''کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

''ماں جی لوگ دوسروں کا حق کیسے مار لیتے ہیں انہیں ذرا احساس نہیں ہوتا کہ کوئی کس قدر ضرورت مند ہے۔'' میں رو دینے والی ہو رہی تھی۔

''ہو کیا گیا؟'' وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

''اس سپروائزر نے صبح پندرہ روپے اجرت مقرر کی تھی دستخط بھی پندرہ روپے پر ہی لئے تھے لیکن دیئے صرف دس روپے یعنی روزانہ پانچ روپے اپنے اس مٹکے سے پیٹ میں ڈالے گا لیکن اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہوں گے اسے میرے پیسے۔ اللہ کرے پیٹ میں اس کے ایسے مروڑ اٹھیں کہ سارا حرام کا مال باہر آجائے۔''

''ہوتا ہے سعدیہ ایسا بھی ہوتا ہے بس تم چپ چاپ وقت گزارو۔ کرنے دو جو کوئی برا

کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے عمل کی پوری جزا یا سزا دے گا تم اٹھو کھانا کھالو۔''

صبح سویرے اس مٹکے پیٹ والے سپروائزر کی شکل دیکھنے کا میرا بالکل موڈ نہیں تھا لیکن جانا تو تھا ہی اور پھر یہ معمول بن گیا۔ روز صبح اس کی منحوس شکل دیکھنی پڑتی تھی اور واپسی پر دس روپے وصول کرتے ہوئے جلنا کڑھنا پڑتا تھا۔

ایسے ہی ایک دن میں جلی کڑھی ہوئی واپس گھر پہنچی تو تایا جی اور تائی جی گھر کے صحن میں ابا جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ابا جی حسبِ معمول چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اب تک اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھے، حالانکہ انہیں گھر پر ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ورزشیں بھی باقاعدگی سے کرائی جاتی تھیں۔ ماں جی بھی وہیں قریب ہی پیڑھی پر مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔

''آ گئی ہے تمہاری کمانے والی بیٹی۔'' تایا جی کے لہجے میں طنز تھا۔

میں سرسری نظر ان پر ڈال کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''سعدیہ!'' تایا جی کی تحکمانہ آواز سن کر میرے قدم رک گئے۔

''جی!'' میں ان کے قریب چلی گئی۔

''کل سے تم اس گھٹیا ملازمت پر نہیں جاؤ گی۔'' ان کی آواز کا تحکمانہ پن بدستور تھا۔

میں تو پہلے ہی اپنے پانچ روپوں پر جلی بیٹھی تھی اور سارا لاوا کسی نہ کسی پر انڈیلنا چاہتی تھی۔

''کیوں؟ کیا کل سے اللہ تعالیٰ نے بطور خاص ہمارے لئے من وسلویٰ نازل کرنا ہے یا پھر آپ مجھے اس گھٹیا ملازمت کی بجائے کسی فیکٹری میں ایم ڈی لگوا رہے ہیں۔''

تایا جی اور تائی جی ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں مجھ سے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔

میں یوں بھی خاندانی سیاست سے پرے رہتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

''واہ واہ مبارک ہو بھائی جان آپ کی بیٹی کو باہر کی ہوا لگ گئی ہے۔'' تائی جی کب موقع ہاتھ سے جانے دیتی تھیں۔

''آپ نے مجھ سے یہی کہنا تھا؟'' میں نے تائی جی کی بات نظر انداز کر دی۔

''میں زیادہ لمبی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' تایا جی اب پہلے جھٹکے سے سنبھل چکے تھے اور

ایک بار پھر انہوں نے تحکم اور متانت کی چادر اوڑھ لی تھی۔ ''میں نے کہہ دیا ہے کہ کل سے تم ملازمت پر نہیں جاؤ گی۔''

''جی بہت اچھا۔'' مجھے سعادت مندی کا مظاہرہ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔

''آپ کل سے روزانہ شام کو دس روپے بھجوا دیا کریں۔''

''تمہاری بیٹی کو بزرگوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں رہا۔'' تایا جی دھاڑے۔

''نہ سعدیہ بیٹی بڑوں سے ایسے بات نہیں کرتے۔'' ماں جی گھبرا گئیں۔ ''تم جاؤ اپنے کمرے میں۔''

''ماں جی بزرگوں کو بھی چاہئے کہ وہ چھوٹوں کی زبان نہ کھلوائیں کیونکہ ایک دفعہ جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو پھر کوئی کسی کی عزت اور بے عزتی کی پرواہ نہیں کرتا۔'' میں نے حتی الامکان تحمل سے کہا۔

''میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔'' تایا جی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''کہاں؟''

''اپنے گھر اور کہاں۔''

''کس حیثیت سے؟''

''بھتیجی کی حیثیت کم ہے کیا؟''

''اور میرے ماں باپ؟''

''انہیں خرچ ملتا رہے گا اصل میں سب کو تمہاری فکر ہے جب تک تمہارا رشتہ کہیں طے نہیں ہو جاتا تم ہمارے ساتھ رہو گی۔''

''مان لیا تایا جی کہ آپ کو واقعی میری بہت فکر ہے۔'' میرے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

''آپ مجھے بھتیجی کی حیثیت سے نہیں نوکرانی کی حیثیت سے لے جانا چاہتے ہیں۔ جسے آپ کے گھر برتن مانجھنے، کپڑے دھونے اور صفائی ستھرائی کرنے کی اجرت کے طور پر دو وقت کی روٹی اور آپ کی بیٹیوں کی اترن ملے گی۔ نہیں تایا جی مجھے آپ کے گھر نوکرانی بننا منظور نہیں ہے۔ میں اپنے ماں باپ سے جدا نہیں ہوں گی، آپ جو بھی خرچ دیں گے ہم تینوں اس میں گزارا کر لیں گے، لیکن مجھے آپ کے گھر جانا منظور نہیں ہے۔''

''دیکھ لیا کیسی زبان چل رہی ہے، اسے اس کی دو گز کی زبان سمیت گھر لے آئے تو روز اودھم مچا کرے گا، نہ بابا نہ میں تو کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔'' تائی جی نے بھی محاذ کھول دیا۔

''سعدیہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔'' ابا جی کمزور سے لہجے میں بولے۔ ''میری ایک ہی تو اولاد ہے میں مرنے سے پہلے اسے یوں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا، ہاں اگر کوئی خوشی سے اس کا ہاتھ تھامے تو میں اسے رخصت کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاؤں گا لیکن یوں نہیں۔''

''ہاں کماؤ بیٹی جو ہے ہاتھ سے کیسے جانے دیں گے۔'' تائی جی اتنی آہستگی سے بولیں کہ بھرم بھی رہ جائے اور سب سن بھی لیں۔

''میں ایک اور ایسا لفظ نہیں سنوں گی۔'' میں چیخی۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے آپ لوگوں نے ہمیں؟ جو آتا ہے ہمیں جوتیاں مار کر چلا جاتا ہے اور ہم چپ رہتے ہیں لیکن اب وہ وقت نہیں رہا اب میں بولوں گی اور ضرور بولوں گی۔ میں نے کہہ دیا ہے آپ سے کہ روزانہ دس روپے بھجوا دیا کریں، میں کام پر نہیں جاؤں گی۔ نہیں دے سکتے تو اپنا راستہ ناپیں۔''

''کس قدر بدتمیز لڑکی ہے یہ۔'' تائی جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''چلیں جی میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہوں گی۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے سکھ کا سانس لیا لیکن گھنٹہ بھر بعد ہی چاچا جی اور چاچی نازل ہو گئے۔

''آج خوب پذیرائی ہوئی بڑے بھائی کی اس گھر میں۔'' چاچا نے آتے ساتھ شکوہ کیا۔

''ان کی ویسی ہی پذیرائی ہوئی ہے جیسا کہ ہونا چاہئے تھی۔'' میں اپنے کمرے سے نکل آئی۔

''تم اندر جاؤ سعدیہ!'' ماں جی گھبرا کر میری طرف بڑھیں۔

''یوں ڈر کر رہنا بہت مشکل ہے ماں جی!'' پھر میں چاچا جی کی طرف مڑی۔ ''چاچا جی انہوں نے مجھے ملازمت سے منع کیا تھا میں بہت خوش ہو کر ملازمت چھوڑ دوں گی کیونکہ مجھے

بھی یہ ملازمت پسند نہیں لیکن ظاہر ہے ہمیں باعزت طور پر زندہ رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں سے پیسے تو چاہئیں۔ ابا جی کا علاج معالجہ ہے، مکان کا کرایہ ہے، گھر کا خرچ ہے۔ سو ضرورتیں ہیں ہماری، میں نے تایا جی سے اتنی درخواست کی تھی کہ وہ اس سب خرچ کو پورا کرنے کے لئے دس روپے روز کے حساب سے بھجوا دیا کریں۔ اتنی ہی میری اجرت بھی ہے میں ملازمت پر اصرار نہیں کروں گی۔ یہ بات انہیں ناگوار گزری ہے حالانکہ میری یہ درخواست بالکل جائز تھی۔''

''تم جانتی ہو کہ وہ روزانہ دس روپے نہیں دے سکتے۔ ان کے اپنے خرچے ہیں، گھر داری ہے۔ بچے پڑھ رہے ہیں، بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ وہ کہاں سے روزانہ اتنے پیسے لائیں۔'' چاچا جی بولے۔

''تو پھر مجھے کام پر جانے سے نہ روکیں، گھر کا خرچ چلانے کے لئے کہیں سے تو رقم چاہئے۔''

''وہ تمہیں اپنے گھر لے جا تو رہے تھے، بھائی جان اور بھابی جان کے لئے خرچ دینے پر بھی تیار تھے۔''

''کتنی عجیب بات ہے کہ وہ خرچ صرف اس صورت میں دیں گے جب میں ان کے گھر رہنے جاؤں گی۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ٹھیک ہے وہ بیشک زیادہ پیسے نہ دیں، جتنے ابا جی اور ماں جی کو دینا چاہتے ہیں اتنے ہی دے دیں۔ ہم تینوں اتنے میں ہی گزارہ کر لیں گے۔''

''تم جانا کیوں نہیں چاہتی ان کے ساتھ؟'' چاچی جی بولیں۔

''کوئی تک ہے بھلا اس بات کی یہ دن ہیں جب میرے ماں باپ کو میری ضرورت ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر اوروں کی خدمتیں کرتی پھروں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''ہمارے خاندان میں اس سے پہلے کسی عورت نے ملازمت نہیں کی۔'' چاچا جی نے آخری حربے کے طور پر خاندان کی روایتوں کا حوالہ دیا۔

''جی بالکل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے خاندان والے مل بیٹھ کر مستحق افراد کی مدد کیا کرتے تھے۔ خاندان کے اندر ہی سب کو تحفظ حاصل تھا۔ آپ دونوں بھائی ہمیں یہ تحفظ

دے دیں میری ملازمت کا جواز خود ہی ختم ہو جائے گا۔''

''تمہارے چاچا کی کون سی ٹکسال لگی ہوئی ہے۔'' چاچی جی بڑی جلدی سے بولیں۔

''سفید پوشی کا بھرم قائم رہے یہی بڑی بات ہے۔''

''جی ہاں یہ واقعی بڑی بات ہوتی ہے کیونکہ اب ہمارا یہ بھرم بھی قائم نہیں رہا۔ ہمارا یہ بھرم اسی دن ٹوٹ گیا تھا جب ہم دو دن کے فاقے سے تھے اور آپ لوگ اپنی سفید پوشی کے بھرم کو سنبھالے اپنے گھر کی چار دیواری میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تب فخرو کے ماں باپ نے ہمیں کھانا کھلایا تھا اور پھر ملازمت دلوانے کی بات کی تھی۔ ابا کو تب بھی آپ بھائیوں سے امید تھی لیکن چونکہ نہ آپ کی ٹکسال ہے اور نہ ہی تایا جی مل اونر ہیں۔ اس لئے تین دن کے فاقے اور انتظار کے بعد میں نے نوکری شروع کر دی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب کچھ دینے کے ڈر سے رشتے داروں نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ جب کسی نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ ہمارے گھر چولہا جل رہا ہے یا نہیں؟ ابا جی کو دوائیں مل رہی ہیں یا نہیں؟ اور میں تب تک آپ لوگوں کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ جب تک فخرو کے ماں باپ ہمارے لئے دوپہر کا کھانا نہیں لائے تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنی ذات پر بھروسا کرنا سیکھا ہے، میں اب بھی کہتی ہوں کہ ملازمت میرا شوق نہیں ہے۔ آپ لوگ ہم لوگوں کو عزت سے جینے کا آسرا دیں، میں نوکری چھوڑنے کے لئے ایک لمحے بھی نہیں سوچوں گی لیکن یہ اب ممکن نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں تین تین دن چولہا نہ جلے۔'' میں اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

کافی دیر بعد ماں جی میرے کمرے میں آ گئیں۔

''سعدیہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''ماں جی آپ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا ہوتا۔'' میں اٹھ بیٹھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ بستر پر میرے پاس بیٹھ گئیں۔

''مجھے ڈر ہے بات بڑھ نہ جائے۔''

''کون سی بات؟''

''یہی تمہاری ملازمت پر جانے والی۔''

''ماں جی ڈاکٹر بننے کے بعد کیا میں کام پر نہ جاتی؟''

''تب کی بات اور تھی۔ اتنے سالوں میں حالات، سوچنے کا انداز اور رویے سب کچھ بدل جاتا ہے۔ تب تمہارے ابا فخر کے ساتھ سب سے ٹکر لے سکتے تھے۔ جب سے کھاٹ پر پڑے ہیں انہیں اپنی ذات پر بھی اعتبار نہیں رہا۔''

''پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں بالکل نہیں چاہتی کہ تم ان کے گھر جا کر رہو لیکن کیا کروں۔ وہ بہت ناراض ہو کر گئے ہیں یہاں سے۔ ان کی ناراضگی دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تم ان کی بات مان لو۔''

''اُف ماں جی!'' میں نے اپنے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔ ''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی، وہ ناراض ہی ہوئے ہیں ناں۔ آسمان تو نہیں ٹوٹ پڑا، اگر اس بات پر ناراض ہوئے ہیں تو ہوتے رہیں۔''

''ایسے بات نہ کیا کرو۔'' ماں جی کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

''سوری لیکن آپ سب نے مل کر مجھے اس طرح بات کرنے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے کھل کر تایا جی اور تائی جان سے بات نہیں کی لیکن آپ تو سمجھتی ہیں ناں۔ وہاں عرفان بھائی بھی ہوں گے، چار کمروں کے اس گھر میں کیا میرا اور ان کا آمنا سامنا نہیں ہوگا؟ اور آمنا سامنا ہوگا تو بات چیت بھی ہوگی اور جب بات چیت ہوگی تو تائی جان نے اس سے بڑا فساد کھڑا کرنا ہے جتنا آج ہوا ہے۔ تائی جان نے یہ نہیں دیکھا کہ بات کیا ہوئی ہے۔ انہوں نے رشتے داروں کے سامنے ایک کی دس جڑ دینی ہیں اور میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تو یوں بھی اسی وجہ سے وہاں بہت کم جاتی ہوں۔''

یہ سب باتیں میں بھی سمجھتی ہوں اور اسی لئے میں تمہیں وہاں بھیجنے کی مخالف ہوں لیکن اس مسئلے کا اور کوئی علاج بھی تو نہیں ہے۔'' ماں جی بے حد پریشان تھیں۔

''اسے ایسے ہی چپ چاپ چلنے دیں۔'' میں پھر بستر پر دراز ہو گئی۔ ''بول بول کر بالآخر سب ہی چپ ہو جائیں گے اور سب کچھ سہی لیکن ہمارے رشتے داروں میں آدم خور کوئی نہیں ہے اس لئے مطمئن رہیں کوئی بھی آ کر کھا نہیں جائے گا ہمیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سب اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟''

''خاندان ایک اکائی ہوتا ہے سب ہمیں چھوڑ دیں گے۔ آنا جانا، ملنا جلنا، ملنا ملانا

رشتے داری سب ختم ہو جائے گی۔"

"پھر؟ کیا ہوگا اس سے؟" میں چڑ گئی۔ "ماں جی خاندان اکائی ہوتا تو مصیبت کے وقت ہم یوں اکیلے نہ رہتے۔ رشتے داری اور ملنا ملانا اس وقت کہاں تھا جب ہمارے گھر میں فاقے ہو رہے تھے؟ کون آیا تھا ہمیں کھلانے کے لئے؟ اور اب میں گھر بیٹھ گئی تو کون مفت میں کھلاتا رہے گا؟ یہ تو تایا جی مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں تو میری ہمدردی میں ایسا نہیں چاہتے۔ انہیں پتا ہے کہ نوکرانیاں کس قدر تنخواہ کا مطالبہ کرتی ہیں، میں کیوں مفت کی بیگار بھروں۔ اتنی ہی ہمدردی ہے انہیں ہم سے تو ابا جی کو دکان کیوں نہیں ڈال دیتے۔ میرے رشتے کے لئے باہر بھاگ دوڑ کا مشورہ کیوں دے رہے ہیں جبکہ گھر میں رشتہ موجود ہے۔

نہیں ماں جی رشتہ داریاں یوں قائم نہیں رہتیں۔ سب رشتے ناطے دولت کے ترازو میں تلتے ہیں۔ ہمارے پاس پیسہ ہوتا تو سب اس چوکھٹ پر آ کر سلام کرتے لیکن جب فاقے تھے تو کون رشتہ دار ہمیں پوچھنے آیا تھا؟ خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آئیں ماں جی، جب تک ہم حقیقت کا سامنا نہیں کریں گے تب تک ہم اپنے مسائل کا بھی حل نہیں کر سکیں گے۔"

ماں جی گہرا سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "تم آرام کرو اب صبح تمہیں جانا بھی ہوگا۔"

صبح حسب معمول سپروائزر کی منحوس شکل دیکھ کر کام کا آغاز ہوا۔ میرے ہاتھ ہمیشہ کی طرح مسالوں کے ڈبوں کی پیکنگ میں مصروف تھے اور دماغ کل کے واقعے میں اٹکا ہوا تھا۔ جب وہ اخبار تھامے میرے قریب آ گیا۔

"تم نے میٹرک کا امتحان دے رکھا ہے نا؟" اس نے بلاوجہ اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

"جی!" میری نظریں بدستور ڈبوں پر تھیں۔

"آج کے اخبار میں نتیجہ آیا ہوا ہے۔"

"سچ!" مجھے اپنی پریشانی میں یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میرے امتحان کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

"رول نمبر بتاؤ اگر پاس ہوئیں تو تمہیں سب کا منہ میٹھا کروانا ہوگا۔" اس نے اخبار

کھول کر نتیجے والا صفحہ میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

میرے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ "میری دیہاڑی سے جو پانچ روپے آپ آج کاٹیں گے ان سے مٹھائی منگوا کر کھا لینا۔" میں نے خشک انداز میں کہا اور پھر سے کام میں مصروف ہو گئی۔

وہ قہر آلود نگاہ ڈال کر واپس مڑ گیا۔

"ہونہہ بڑا آیا غصہ دکھانے والا۔" میں ایک بار پھر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگی۔ "جس دن قبر میں اس کے پیٹ کا منہ پھٹے گا اس دن سمجھ آئے گی۔ پھر جتنے پیسے اس نے حرام کے ہڑپ کئے ہیں سب سانپ بچھو بن کر اس کے اندر سے نکلیں گے اور یہ جو تہہ در تہہ گوشت اور چربی چڑھا رکھی ہے اپنی ہڈیوں پر۔ ان کو کیڑے مکوڑے نوچ نوچ کر کھائیں گے، جیسے اس نے ہماری زندگی اجیرن کر رکھی ہے ویسے ہی اس کے اس گوشت کے پہاڑ جیسے وجود کی مرنے کے بعد والی زندگی اجیرن ہوگی۔ خوب گرز پڑیں گے فرشتوں کے اسے سارا کھایا پیا بھول جائے گا۔"

"ہوں!" اپنے قریب ایک مردانہ آواز سن کر میں اپنے خیالات سے چونکی۔

ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس درمیانی عمر کا ایک شخص تعریفی نگاہوں سے میرے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک جوان شخص کھڑا تھا، بے نیازی کی تصویر بنے منہ میں سگریٹ دبائے وہ دیکھ میری ہی جانب رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ ان دونوں کے ساتھ تیسرا شخص ہمارا وہی موٹی توند والا سپروائزر تھا جس کے چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ تھی اور سر سے پاؤں تک Yes Sir اور Your Most Obedient Servent کے شیرے میں لتھڑا ہوا تھا۔ یہ تمام جائزہ لینے میں مجھے بمشکل دو سیکنڈ لگے اور میں ایک بار پھر نظریں جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"آپ یہاں نئی ہیں آپ کو کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟" ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس شخص نے مجھے مخاطب کیا۔

"آپ کس حیثیت سے میرے مسائل حل کریں گے؟" میں نے نظریں اٹھائیں۔

"میں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ شاہ صاحب ہیں مالک ہیں فیکٹری کے۔" سپروائزر نے جلدی سے مداخلت کی۔

"اچھا" میں نے نگاہیں پھر مسالوں کے ڈبوں پر مرکوز کر دیں اور تیزی سے پیکنگ میں مصروف ہو گئی۔

"اگر آپ کو کوئی پرابلم ہو تو بتائیں میں اپنی فیکٹری میں کام کرنے والوں کو اچھے سے اچھا ماحول دینا چاہتا ہوں۔"

"اچھا ماحول؟" میں نے اردگرد ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ "جی اس بات کا اندازہ مجھے اس ایک مہینے میں ہو گیا ہے اپنے ورکرز کو اچھا ماحول دینے پر میں آپ کا شکریہ ہی ادا کر سکتی ہوں۔"

"آیئے سر آ گئے۔" سپروائزر نے ایک مرتبہ پھر جلدی سے مداخلت کی۔

"لگتا ہے آپ کو کچھ شکایت ہے؟" اس کے لہجے میں دلچسپی تھی اور اس نے سپروائزر کی بات نظر انداز کر دی تھی۔ "میں مہینے میں ایک بار اپنے ورکرز سے ذاتی طور پر ملتا ہوں اور ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ مجھ سے کھل کر بات کر سکتی ہیں۔"

"جی میں سمجھتی ہوں لیکن میں آپ سے کھل کر بات نہیں کر سکتی کیونکہ اب آپ ایک مہینے بعد اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس سے باہر نکلیں گے لیکن میرے پاس عافیت کا کوئی ایسا ٹھکانہ نہیں ہے جہاں میں بھی ایک مہینے کے لئے ہائبرنیشن میں چلی جاؤں۔ فی الحال یہیں ان لوگوں کے درمیان کام کرنا ہے اور یہ میرا شوق نہیں مجبوری ہے۔"

"ہوں!" شاہ جی نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

"اتنی سمجھدار لڑکی کو تم نے پیکنگ جیسے واہیات کام پر لگا رکھا ہے۔" شاہ جی کے ساتھ کھڑے شخص کی بے نیازی چٹخنے لگی۔

"سر جی یہ باتیں بہت بناتی ہے کام کم کرتی ہے۔" سپروائزر نے جلدی سے شکایت داغ دی۔ "ذرا سا پڑھ لکھ گئی ہے اس لئے نخرے دکھاتی ہے۔"

"تم چپ رہو۔" شاہ جی نے اسے گھورا پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "بی بی آپ وہاں آفس میں آئیں۔"

میرے ساتھ کام کرنے والی عورتیں اور لڑکیاں ہاتھ روک کر مجھے ایسے ذوق وشوق سے

دیکھنے لگیں جیسے میں مداری کی ڈگڈگی پر ناچنے والی بندریا ہوں۔ میں چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے اس چھوٹے سے کیبن کی طرف چل دی جسے آفس کہہ کر انہوں نے اس کا رتبہ بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

"بیٹھئے" بڑی اور بھدی سی میز کے عقب میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر شاہ صاحب نے مجھے بھی میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاہ صاحب کا وہ بے نیاز ساتھی بھی ایک کرسی پر ٹک چکا تھا۔ میرے ساتھ والی کرسی پر سپروائزر بیٹھنے لگا تو شاہ صاحب نے اسے کڑوے تیوروں سے گھورا۔

"تمہیں اندر بلایا ہے میں نے؟"

"جی نہیں سر!" وہ اٹھنے بیٹھنے کی پوزیشن کے درمیان ہوا ہی میں معلق ہو گیا۔

"پھر کوئی کام ہے کیا؟"

"نہیں سر میں چلا جاتا ہوں میں نے سوچا کہ شاید آپ کو میری ضرورت پڑ جائے۔" وہ اب بھی اسی انداز میں ہوا میں لٹکا ہوا تھا۔

"تمہاری ضرورت ہوئی تو میں خود تمہیں اندر بلا لوں گا۔"

"بہتر! سر" وہ باہر چلا گیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں فیکٹری کے ماحول کو ورکرز کے لئے بہتر بنانا چاہتا ہوں۔ اس میں میری بھی غرض پوشیدہ ہے کیونکہ جتنی ورکنگ کنڈیشنز اچھی ہوں گی اتنی ہی پروڈکشن زیادہ ہو گی۔ فائدہ مالک کو بھی ہو گا اور مزدور کو بھی۔" شاہ صاحب پیپر ویٹ گھماتے ہوئے بولے۔ "لیکن مجھے احساس ہوا ہے کہ آپ اس ماحول سے خوش نہیں ہیں۔"

"جی میں خوش نہیں ہوں۔" شاہ صاحب کی منتظر نگاہوں کے جواب میں مَیں نے کہا۔

"لیکن میں جانتی ہوں کہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"کیا تو جا سکتا ہے اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں۔" شاہ صاحب نے اپنے لہجے میں حتی الامکان دوستی پیدا کی اور یقین کریں کہ اپنے مسائل کا تذکرہ کرنے کے بعد آپ کو ہائبرنیشن میں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ میں آپ کے مسائل حل کروں گا۔

شاہ صاحب کے ساتھی کی تمام تر توجہ اب مجھ پر تھی۔

"مجھے یہ ملازمت بہت زیادہ مجبوری کے تحت کرنی پڑ رہی ہے۔" میں نے با اعتماد انداز میں کہنا شروع کیا۔ "اور میرے لئے ایک ایک روپے، یہاں تک کہ ایک ایک پیسے کی بے حد اہمیت ہے اور مجھے ہی نہیں سارا دن محنت مزدوری کرنے والے ہر شخص کے لئے اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے یہاں پندرہ روپے یومیہ کے حساب سے مزدور رکھا گیا تھا، روزانہ واپسی پر اجرت وصول کرتے ہوئے بھی میں رجسٹر پر اتنی ہی رقم کے سامنے دستخط کرتی ہوں لیکن آپ کا یہ سپروائزر جو آپ کے سامنے موسٹ اوبی ڈینٹ سرونٹ کی مجسم تصویر بنا رہتا ہے۔ میرے ہاتھ پر صرف دس روپے رکھتا ہے اور وہ بھی اس طرح جیسے یہ میری دن بھر کی محنت کی کمائی نہ ہو بلکہ میں اس سے بھیک طلب کر رہی ہوں اور وہ از راہِ ہمدردی مجھے یہ رقم عنایت کر رہا ہے۔"

"ہوں!" شاہ صاحب کی نظریں میرے چہرے پر تھیں اور انگلیاں پیپر وٹ گھما رہی تھیں۔"

"کیا اور ورکرز کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"جی۔"

"بات چیت سے تو آپ کافی سمجھدار اور لائق لگتی ہیں پھر آپ نے کوئی اچھی جاب کیوں نہیں کی؟"

"کیونکہ فی الحال میرے پاس سمجھداری اور لیاقت کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ آج ہی میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا ہے جو ابھی تک میں نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ میری جدوجہد جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ آہستہ آہستہ میں اپنے قدم ضرور آگے بڑھاؤں گی۔"

شاہ صاحب کے چہرے پر ستائش کی چمک ابھری اور ان کے ساتھی کے چہرے سے بے نیازی کی برف مکمل طور پر پگھل گئی۔

"That is Spirit" شاہ صاحب بولے۔ "مجھے آپ کی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی ہے آج سے آپ کی تنخواہ بیس روپے ہوگی۔ میں سپروائزر بھی تبدیل کر رہا ہوں، اول تو نئے سپروائزر سے آپ کو کوئی شکوہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ خاصا قابل اعتماد آدمی ہے لیکن پھر بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ فیکٹری کی مرکزی عمارت میں میرے آفس میں آجائیں اور مجھے

یقین ہے کہ آپ میٹرک بھی اچھے نمبروں سے کلیئر کر لیں گی۔"

"بہت بہت شکریہ سر!" میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

یہ سب کچھ میری توقعات کے برعکس ہوا تھا، میرے لئے تو اجرت میں سو فیصد اضافہ ہوا تھا۔ دس روپے سے ایک دم بیس روپے پر چھلانگ لگانا مجھے خوشی کے مارے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا۔

"کیا زمانہ ہے۔" میں ہال میں پہنچی تو مجھے دیکھ کر سپروائزر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"جب لوگوں کو نوکری کی ضرورت ہوتی ہے تو میں ہی کام آتا ہوں، جب پیٹ میں گندم کے دانے پہنچ جاتے ہیں تو لوگ میری شکایت کرنے لگتے ہیں۔"

میں ان سنی کر کے اپنی نشست پر پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟" پروین نے سرگوشی کی۔

"کچھ نہیں۔" میں کام میں مصروف ہوگئی۔

میری اس بے نیازی سے پروین سمیت ہال میں کام کرنے والی سبھی لڑکیوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے لیکن تھوڑی دیر بعد جب آفس سے نکل کر شاہ صاحب نے سپروائزر کو بلا کر اسے آفس میں رپورٹ کرنے کو کہا تو جیسے انہیں قرار آ گیا اور وہ ویسی ہی دلچسپی سے مجھے، شاہ صاحب اور سپروائزر کو دیکھنے لگیں جیسے بہت دیر کے انتظار کے بعد مداری کے تماشے کا پہلا ایکٹ دیکھا جاتا ہے۔

اس ساری کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے شعبے میں ایک نیا سپروائزر آ گیا اور اس شام مجھے دس کی بجائے بیس روپے ملے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں یہ خوشخبری ماں جی اور ابا جی کو دینا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے مجھے ایک خوشخبری سنا دی۔

"لو یہ منہ میٹھا کرو۔" ماں جی نے میرے منہ میں برفی ڈال دی۔

"ضرور آج تو اسی کا دل چاہ رہا تھا۔" میں ہنسی۔ "لیکن یہ ہے کس سلسلے میں؟"

"لو تمہیں خبر ہی نہیں ہے کچھ۔" ماں جی نے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "آج تمہارا نتیجہ نکلا ہے ناں۔"

"ہاں پتا تو مجھے بھی چلا تھا لیکن میں نے دیکھا نہیں۔" میں جلدی سے اخبار کی طرف

لیکی۔

''فرسٹ ڈویژن ہے میری بیٹی کی۔'' ابا جی کی آواز فرطِ مسرت سے لرز رہی تھی۔

''آج میرا سر فخر سے کتنا بلند ہو گیا ہے۔''

میں نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ نہ جانے میرے ایک قدم آگے بڑھنے کی خوشی میں یا اپنی معذوری کے احساس سے کہ ان کے لئے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے سینے سے لگانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں ان کی چارپائی کے کنارے ٹک گئی اور اپنا سر جھکا دیا۔ ابا جی نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

''ابا جی میں ان شاء اللہ آپ کا خواب ضرور پورا کروں گی۔'' میں نے آہستہ سے ان کے کان میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ماں جی میرے پاس بھی آپ کے لئے ایک خوشخبری ہے۔''

''کون سی خوشخبری؟''

''یہ'' میں نے بیس روپے ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''آج دس کی بجائے بیس روپے کیوں؟''

جواب میں مَیں نے انہیں پوری روداد سنا دی۔

''اللہ تعالیٰ انہیں صلہ دے۔'' ماں جی نے دوپٹہ پھیلا کر انہیں دعا دی۔ ''بیٹیا رانی اب کل انہیں اپنے پاس ہونے کی مٹھائی ضرور کھلانا۔''

''ماں جی مجھے پسند نہیں کیا کہیں گے وہ لوگ کہ میں خوامخواہ ہی لیس ہوئی جا رہی ہوں۔''

لیکن انہوں نے یہ نہیں کہا' اُلٹا اگلے ہی دن آ کر یہ مطالبہ داغ دیا۔

''اب جب آپ پاس ہو گئی ہیں اور آپ کو ہم سے کچھ شکایت بھی نہیں رہی تو کیا ہمیں اس خوشی میں مٹھائی نہیں کھلائیں گی؟'' شاہ جی کے ساتھی نے کہا۔

''جی ضرور۔'' میں نے اس غرض سے فوراً ہامی بھر لی کہ میں اس سے زیادہ لمبی گفتگو نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی ہمارے گھرانے میں کنوارے نظر آنے والے کسی بھی مرد سے عورتوں کی بات چیت کو گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ ''کل کھلاؤں گی۔'' اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے کام میں

مصروف ہو گئی۔

لنچ ٹائم میں کام سے فارغ ہو کر ہم سب نے اپنے اپنے ٹفن کھولے۔

''بڑی ہی اونچی چیز ہے یہ انیس شاہ۔'' شمشاد نے اس دن کی گوسپ کا گویا باقاعدہ آغاز کیا۔ ''بالکل برف کا ڈلا لگتا ہے۔''

''اب شاید پگھل جائے آہستہ آہستہ۔'' پروین نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کس نے لو دکھائی ہے برف کے اس ڈلے کو؟'' چھیما نے جو رسالے پڑھ پڑھ کر ڈائیلاگ بولنے کی عادی ہو گئی تھی، اپنے ٹفن سے سر اٹھایا۔

''سیدھی زبان میں بات کیا کر۔'' رمضان بیگم کو گفتگو میں شریک نہ ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔

''ماسی یہ پوچھ رہی ہے کہ برف کا ڈلا پگھلا کیسے؟'' زبیدہ نے جلدی سے وضاحت کی۔ ''دو دن غیر حاضر رہی ہے ناں۔''

''بھئی اپنی سعدیہ نے اور کس نے۔'' پروین نے آنکھ ماری۔

''میں نے؟'' میں جو بے حد دلچسپی سے ان لوگوں کی گوسپ سن رہی تھی حیران ہی رہ گئی۔ ''مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ انیس شاہ ہے کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم لوگ؟''

''لو اسے انیس شاہ کا بھی نہیں پتا۔'' بشیراں نے ناک پر انگلی رکھ لی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم نے اسے مٹھائی کھلانے کا وعدہ کیا ہے۔''

''مٹھائی کھلانے کا وعدہ؟'' میں زیرِ لب بڑبڑائی۔

''اچھا۔'' مجھے اچانک یاد آ گیا۔ ''تو شاہ صاحب کے ساتھ جو بندہ آتا ہے وہ ہے انیس شاہ، لیکن میں تو اس سے کل ہی پہلی مرتبہ ملی ہوں اور آج پہلی مرتبہ اس سے تم لوگوں کے سامنے ہی بات کی ہے۔''

''پھر بھی یہ حال ہو گیا ہے کہ تیرِ نظر دل کے آر پار ہو گیا۔'' چھیما ہنس پڑی۔

''کوئی تیرِ نظر آر پار وغیرہ نہیں ہوا۔'' میں سختی سے بولی۔ ''میں یہاں تیرِ نظر چلانے نہیں آتی۔ یہی کام کرنا ہوتا تو مجھے گھر سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے اپنے خاندان میں ایک سے ایک اچھا لڑکا ہے جن پر میں زیادہ آسانی کے ساتھ تیرِ نظر چلا سکتی تھی۔ یہاں میں

کام کرنے آئی ہوں اور بس۔"

ایک لمحے کو تو سبھی چپکی رہ گئیں پھر رمضان بیگم لپک کر میرے قریب آ بیٹھی۔

"ابھی تو بچی ہے یہ فضول باتیں کر کے کیوں اس کا دل برا کرتے ہو۔ اتنے دن سے یہ ہمارے ساتھ ہے اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ ہر وقت چادر سر پر ہوتی ہے اور نظریں بھی جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔"

"اے ہاں تو اور کیا۔" بشیراں کو بھی اچانک اپنی بزرگی کا احساس ہوا اور بولی۔ "آج بھی کتنی سی بات کی ہے اس نے یہی ناں کہ اس نے پاس ہونے پر مٹھائی مانگی اور اس نے ہاں کہہ کر بات ختم کر دی۔"

"ارے ماسی ہاں کہنے سے بھی کبھی بات ختم ہوتی ہے۔" شمشاد ہنسی۔ "ہاں کہنے سے تو بات شروع ہوتی ہے۔"

"نہیں یہ بچی ایسی نہیں ہے۔" رمضان بیگم بگڑ کر بولی۔

"وہ تو جو بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ انیس شاہ جس نے بات کرنا تو دور رہا کبھی آنکھ اٹھا کر بھی ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ اس نے آج سعدیہ سے نہ صرف بات کی ہے بلکہ مٹھائی بھی مانگی ہے۔" شمشاد نے حتمی لہجے میں کہا۔

"کی ہے پھر؟" میں نے اسے گھورا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس نے تم سے بات کی ہوتی تو تم خوشی سے پھول کر کپا ہو جاتیں۔" لیکن میرے دماغ میں تمہاری طرح بھس نہیں بھرا ہوا۔" میں نے کولر کھول کر زنجیر کے ساتھ لٹکے ہوئے گلاس میں پانی بھرا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

میری زندگی کا محور اتنا محدود تھا کہ رات کو سونے سے قبل پورے دن کی روداد کسی فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے چلنے لگتی تھی اور اس رات کی فلم میں انیس شاہ اور اس پر کیے گئے سب کے تبصروں کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔

"بکواس کرتی ہیں ساری۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "ان لڑکیوں کے پاس اور کوئی موضوع ہی نہیں ہے۔ لڑکے، لڑکے اور صرف لڑکے۔ سرخ مفلر لہراتے لڑکے، ان کے قریب گنگناتے لڑکے، دور سے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کرتے لڑکے اور پاس سے

گزرتے ہوئے سائیکل کی گھنٹی بجاتے لڑکے۔ ان کی زندگی اس قدر محدود کیوں ہے؟ اس کے علاوہ دنیا میں کچھ نہیں ہے، افسانے پڑھ پڑھ کر اور فلمیں دیکھ دیکھ کر انہیں ہر وقت یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ گھر کے دروازے سے باہر نکلتے ساتھ ہی یہ بھی کسی افسانے یا فلم کی ہیروئن بن جائیں گی اور راہ چلتا ہر لڑکا مرضِ عشق میں گرفتار ہو جائے گا، ہونہہ پاگل لڑکیاں۔" میں نے کروٹ بدل لی۔

اگلے دن لنچ ٹائم تک ایک سیر مٹھائی سبز رنگ کے گڈی کاغذ میں لپٹی ہوئی میرے ساتھ ہی پڑی رہی۔

"اب یہیں مٹھائی باسی کر دینے کا ارادہ ہے کیا؟" رمضان بیگم بولیں۔

"میرا خیال تھا کہ آج شاہ صاحب آئیں گے تو ان کے حوالے کر دوں گی۔"

"وہ تو مہینے میں ایک ہی چکر لگاتے ہیں یہ تو پتا نہیں کل کیسے انیس شاہ صاحب چلے آئے تھے ایسا کرو تم خود ہی دے آؤ۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا خود جانا، آ گئے تو دے دوں گی۔"

"ارے ایسی بھی کیا بے مروتی۔" وہ جلدی سے بولیں۔ "پتا ہے بڑے شاہ صاحب کا سالا ہے انیس شاہ، مالکوں کو خوش ہی رکھنا چاہئے۔ کیا سوچیں گے وہ کہ انہوں نے تمہاری دیہاڑی بڑھائی اور تم نے خوشی کے موقع پر مٹھائی تک دینا گوارہ نہیں کیا۔"

میں ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔

"حرج ہی کیا ہے وہاں لے جا کر دینے میں۔" میں نے سوچا اور ڈبا اٹھا کر مرکزی عمارت کی طرف چل دی جو چند گز کے فاصلے پر تھی۔

دروازہ کھولتے ہی خوشگوار خنکی نے میرا استقبال کیا۔ کمرہ چھوٹا لیکن خوب سجا ہوا تھا۔ دبیز قالین پر ہلکا فرنیچر، میز پر پڑے تین چار ٹیلی فونوں کے ساتھ گلدان میں سجے تازہ گلاب کے پھول اور اس میز کے عقب میں بجی سجائی گڑیا سی لڑکی سوالیہ نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔

"یہ شاہ صاحب کو دینا ہے۔" میں نے چند قدم آگے بڑھ کر ڈبا میز پر رکھ دیا۔

"آپ انتظار کریں میں ان سے بات کرتی ہوں۔" اس کے نازک سے خوبصورت ہاتھ انٹرکام کی جانب بڑھے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں جلدی سے بولی۔ "بس یہ انہیں دے دیں۔"

"کیا بتاؤں کہ کس نے دیا ہے؟"

"میں یہیں پیکنگ میں کام کرتی ہوں آپ کہہ دیجئے سعدیہ نے دیا ہے۔"

ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ اندرونی دروازہ کھلا اور پرفیوم کی دلفریب مہک کے ساتھ شاہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"افشاں آپ نے......" پھر بات کرتے کرتے ان کی نگاہ مجھ پر ٹک گئی۔ "سعدیہ آپ؟ کہیے کیسے آنا ہوا؟"

"سر میں پاس ہونے کی خوشی میں مٹھائی دینے آئی تھی۔"

"تو آپ اندر آئیں ناں۔"

"سر مجھے دیر ہو رہی ہے لنچ ٹائم ختم ہونے والا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، اب جبکہ آپ کے پاس سمجھداری اور لیاقت کا سرٹیفکیٹ ہے تو میں آپ کو بہتر نوکری کی آفر کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے دروازہ کھولا۔ "آیئے۔"

میں ان کے آفس میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رہ گئی۔ اتنا شاندار آفس مجھ جیسی کسی بھی لڑکی کو امپریس کرنے کے لئے کافی تھا۔ بے حد کشادہ اور خوبصورت یہ آفس میری چشم تصور سے باہر تھا۔ بہترین بھاری فرنیچر سے آراستہ خنک کمرے میں پرفیوم اور سگار کی بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ آفس ٹیبل کے عقب میں پڑی ہوئی ریوالونگ چیئر خالی تھی جبکہ پہلو میں موجود کرسی پر انیس شاہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے پاؤں جوتوں سمیت میز پر تھے اور منہ پر ٹائم کا شمارہ رکھے غالباً وہ سستا رہا تھا۔

"بیٹھیے۔" شاہ صاحب نے اپنی نشست پر بیٹھ کر سامنے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں چپ چاپ کرسی پر ٹک گئی۔ انیس شاہ نے رسالہ تھوڑا سا ہٹا کر نیم وا آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور چند ثانیے اسی طرح دیکھنے کے بعد آہستگی سے اپنے پاؤں میز سے اتار کر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"آپ کا لنچ ٹائم ہے آپ نے کچھ کھایا ہے؟" شاہ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"جی میں لنچ کر چکی ہوں۔" میں نے جلدی سے جھوٹ بولا حالانکہ میرے ٹفن میں ابھی تک کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا۔

"آپ کو ٹائپنگ آتی ہے؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اگر آپ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھ لیں تو میں آپ کو یہیں لگوا دوں گا۔ یہاں ماحول بھی اچھا ہے، سب پڑھے لکھے لوگ ہیں اور آپ ان کے درمیان خود کو مس فٹ نہیں سمجھیں گی۔ اس کے علاوہ آپ کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور اوقاتِ کار میں بھی کمی ہو جائے گی اس طرح آپ کو پڑھنے کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔"

"سر مجھے خوشی ہوگی یہ آفر قبول کر کے لیکن ابھی میرے پاس شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کے لئے وقت ہی نہیں بچتا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اتنی دیر ہو جاتی ہے، پھر میرے ابا جی بھی چاہتے ہیں کہ چھٹی کے بعد میں ان کے قریب ہی رہوں۔"

"سعدیہ آپ میرے لئے بھی بالکل بیٹیوں کی طرح ہیں۔" شاہ صاحب بولے۔ "آپ کے ساتھ اور بھی بہت سی خواتین کام کر رہی ہیں لیکن ان کی اہمیت میرے لئے اتنی ہی ہے جتنی کسی بھی ورکر کی ہو سکتی ہے لیکن میں آپ کو عام ورکرز کی فہرست میں شامل نہیں کر رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ کی صاف گوئی پسند آئی ہے۔ میں ان لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو مالک کی چاپلوسی میں وقت ضائع کرنے کی بجائے کام پر توجہ دیں اور سچ پوچھیں تو مجھے آپ میں وہ صلاحیت بھی دکھائی دی ہے جو آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ بس اس صلاحیت کو جلا دینے کے لئے سازگار حالات چاہئیں اور میں آپ کو وہ حالات دینا چاہتا ہوں۔"

"بہت شکریہ سر!" میں واقعی ان کی ممنون تھی۔

"آپ ابھی مس افشاں کے پاس چلی جائیں وہ آپ کو بھٹی صاحب کے پاس لے جائیں گی۔ بھٹی صاحب آپ کو ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سکھائیں گے اور جب وہ او کے کی رپورٹ دیں گے تو یہاں آپ کا باقاعدہ تقرر ہو جائے گا۔"

"سر میرے پاس الفاظ نہیں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے۔"

"اس میں شکریے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ ہی میں کوئی فیور کر رہا ہوں۔ اس میں تو میری اپنی غرض ہے کہ فیکٹری کو اچھے ورکرز ملیں۔"

بھٹی صاحب بہت اچھے انسان تھے۔ انہوں نے ہر طرح سے میری مدد کی۔ خطوط نویسی Tabulation اور Manuscript Writing وغیرہ میں جلد ہی انہوں نے مجھے طاق کر دیا۔

ہمارے گھرانے میں کنواری لڑکیوں کا مردوں کے ساتھ بات چیت کرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن چونکہ اب میں گھر سے نکل ہی آئی تھی اور ایک ایسی جگہ کام کر رہی تھی جہاں مردوں کی اکثریت تھی، اس لئے بات چیت بھی کرنی پڑتی تھی۔ شروع شروع میں تو میں خاصی جھجکتی تھی پھر آہستہ آہستہ عادی ہوگئی، پھر بھی کسی سے زیادہ فری نہیں ہوتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ صرف اتنی ہی باتیں کرتی تھیں جتنی کہ ضرورت پڑتی۔ یوں بھی میں سارے عملے میں سب سے کم عمر تھی اور سب مجھ سے ایسا سلوک کرتے تھے جیسے بچوں سے کیا جاتا ہے، اس لیے بھی میری کسی سے دوستی نہیں ہوسکی تھی۔

میرے سیکشن میں سبھی کولیگ بھٹی صاحب کی میز کے گرد جمع ہو کر چائے کے وقفے میں دنیا جہاں کی گوسپ کیا کرتے تھے اور میں ان سے الگ تھلگ بیٹھ کر ٹائپ رائٹر سامنے رکھے ساٹھ الفاظ فی منٹ کی رفتار تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ ان میں سے بھی کبھی کسی نے مجھے اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت نہیں دی تھی۔ ہاں بعض اوقات اتنے بہت سے سروں کے درمیان سے بھٹی صاحب کا سر طلوع ہوتا اور وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے گویا ہوتے۔

"سعدیہ بیٹے کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟"

"نہیں سر۔"

میرے جواب پر وہ مطمئن ہو جاتے۔ "یہ بچی بہت محنت سے کام کرتی ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ان کا سر بقیہ سروں کے جمگھٹے میں غروب ہو جاتا، ایسے میں کس سے دوستی کی جاتی۔

کچھ لڑکیاں بھی وہاں کام کرتی تھیں لیکن ان کی بھی دنیا الگ تھی۔ وہ سب بھی کسی ایک

میز کے گرد جمع ہو کر بیٹھ جاتیں اور پھر ان کے گروپ سے سرگوشیاں ابھرتیں۔ دبی دبی ہنسی کی آواز آتی اور کبھی ایک دم اتنے زور کا قہقہہ پڑتا کہ بھٹی صاحب کی میز کے گرد جمع سب لوگوں کے سر ایک ساتھ وہاں گھوم جاتے۔

آفس میں بہت سی دلچسپیاں تھیں لیکن میں ان سے الگ ہی رہتی تھی اور دور دور سے انہیں دیکھا کرتی تھی۔ وہ صغیر صاحب تھے جو پروانے کی طرح افشاں کے گرد چکر لگایا کرتے تھے۔ ادریس صاحب حمیرا پر فدا تھے۔ نوازش شکیلہ کی میز کے قریب سے گزرنے سے پہلے جیب سے کنگھی نکال کر اپنے بال ضرور ٹھیک کیا کرتے تھے اور پھر کسی نہ کسی بہانے اس کے پاس ضرور رکتے تھے اور وہ سمیع تھا جو اپنی میز پر بیٹھ کر سب کام چھوڑ کر نسیمہ کی طرف دیوانہ وار دیکھتا رہتا تھا اور جب حمیرا نسیمہ کو ٹہوکا دے کر اس کی طرف متوجہ کرتی تو نسیمہ کے منہ سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑتا تھا۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ صغیر، ادریس، نوازش اور سمیع کی ایک بھی نہیں چلتی تھی۔ شاید پہلے کبھی چلتی بھی ہو لیکن جب سے انیس شاہ آیا تھا ان سب کی ویلیو صفر ہوگئی تھی۔ انیس شاہ اکثر وہاں آتا رہتا تھا، اس کی آمد پر لڑکیوں کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں، میں دل ہی دل میں ان سب پر ہنستی تھی۔

"ایک بیچارا انیس شاہ اور اتنی لڑکیاں۔ سنتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ایک ایک شہزادی کے اتنے پرستار ہوتے تھے کہ وہ سوئمبر رچایا کرتی تھی لیکن یہاں معاملہ اُلٹ ہے۔ اب انیس شاہ کو چاہئے کہ وہ اپنا سوئمبر رچائے۔" یہ سوچ کر میں ہنس پڑتی تھی۔

"Smiling The Lady Killer" یہ وہ خطاب تھا جو سب لڑکیوں نے متفقہ طور پر اسے دے رکھا تھا۔

جب وہ پرفیوم میں مہکا ہوا منہ میں سگریٹ دبائے وہاں آتا تھا تو سب لڑکیاں الرٹ ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر وہ جس سے بات کرتا اس لڑکی کی حالت دیدنی ہوتی تھی، آواز میں ایک دم لوچ پیدا ہو جاتا۔ آنکھیں نیم وا ہو جاتیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگتی اور لیس سر رائٹ سر کی گردان شروع ہو جاتی۔ بات چیت کو خوامخواہ طول دینے کی کوشش کی جاتی، پھر اس کے جانے کے بعد بیگ سے میک اپ مرر برآمد ہوتا اور اس میں اپنا جائزہ لیا جاتا اور اس

جائزے کے دوران سب کو اپنے میں کچھ نہ کچھ کمی محسوس ہوتی۔

میری کسی کے ساتھ دوستی تو نہیں تھی، پھر بھی مجھے اس کے متعلق بہت سی باتیں اِدھر اُدھر سے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ بنیادی طور پر وہ مصور ہے لیکن آج کل اس کے گھر والے اس پر اپنا بزنس شروع کرنے کے لئے دباؤ ڈال رہے ہیں اور بزنس کی تربیت لینے کے لئے ہی وہ یہاں آتا ہے۔ سب کا خیال تھا کہ اسے بزنس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس فیکٹری میں بھی اس کے شیئرز تھے لیکن یہ کہ پیسہ کیسے آرہا تھا اور کہاں جارہا ہے، قسم کی چیزیں اس کا دردِ سر نہیں تھیں۔ وہ ہر شے یہاں تک کہ خود سے بھی بے نیاز رہنے کا عادی تھا۔

سنا تھا کہ مصور اچھا ہے، سنا اس لئے تھا کہ کبھی اس کی بنائی ہوئی تصویریں نہیں دیکھی تھیں۔ جس ماحول میں مَیں رہتی تھی وہاں تصویروں کی نمائش دیکھنا ایک ایسی عیاشی تھی جس کی میں متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اور لڑکیوں کی طرح وہ میرے پاس بھی کام سے آیا کرتا تھا۔ نہ جس لڑکی کے پاس بھی آتا تھا سب کن انکھیوں سے وہیں دیکھنے لگتے تھے، ایسے میں مجھے بہت الجھن ہوتی تھی۔ شروع میں تو اس سے کھنچی کھنچی رہی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ چھ سات ماہ پہلے اس کی شادی ہو چکی ہے تو میں نے ایک حد تک اپنا رویہ تبدیل کر دیا۔

میں حیران ہوتی تھی کہ جب سب لڑکیوں کو معلوم بھی ہے کہ انیس شاہ شادی شدہ ہے تو یہ سب لڑکیاں بیک وقت اس سے عشق کرنے پر کیوں مُصر ہیں۔ ان دنوں میں خود کو بہت عقلمند سمجھتی تھی لیکن درحقیقت اچھی خاصی بیوقوف تھی جو اتنی سی بات پر حیران ہو جاتی تھی۔

میرے کچے اور ناتجربہ کار ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ کنوارہ مرد دنیا کی سب سے ناقابلِ اعتبار چیز ہوتا ہے جبکہ شادی مرد کو معتبر بنا دیتی ہے اور اس کے بعد وہ کسی لڑکی یا عورت کی طرف بری نیت سے نہیں دیکھتا۔ شاید اس کی وجہ محلے بھر کی عورتوں کا کنوارے لڑکوں کے خلاف قائم متحدہ محاذ ہو یا پھر اس کی وجہ وہ نصیحتیں ہوں جو محلے کی ہر کنواری لڑکی کو چاچی، ماسی قسم کی محلہ دار عورتوں سے ہر وقت سننی پڑتی تھیں۔

انہی تمام باتوں کی وجہ سے میرا خیال تھا کہ انیس شاہ بذاتِ خود بہت اچھا شخص ہے اور ان لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور یہ خوامخواہ ہی اس پر مری جارہی ہیں۔

جب میرے قریب لگی حمیرا کی میز سے سرگوشیاں اٹھیں۔

''آج صبح جب میں آرہی تھی تو سر انیس نے کہا تھا کہ آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔'' ایک کہتی۔

''لو یہ اسی پر اترا رہی ہے کل جب میں بس سٹاپ کی طرف جارہی تھی تو انہوں نے مجھے گھر تک لفٹ دی تھی۔''

''سچ؟'' کوئی حیرانی سے کہتی۔

''تو اور کیا۔''

''تمہیں صرف لفٹ کی پیشکش کی تھی مجھے انہوں نے لنچ کرایا تھا۔'' پھر کوئی اتراتی۔

اور میں دل ہی دل میں ہنس پڑتی۔ وہ جو اتنی بے اعتنائی سے ان سے بات کرتا ہے، وہ بھلا ایسی پیشکش کرے گا جب ذرا آفس میں مسکرا کر بات کر لے تو چار چار دن تک یہ خوشی سے پاگل رہتی ہیں۔ اگر سچ مچ لنچ پر بلا لے تو یہ تو خوشی سے مر ہی جائیں اور پھر میں اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

''سعد یہ میری تصویروں کی نمائش لگ رہی ہے کل۔'' اس دن انیس شاہ میرے پاس چلا آیا۔ ''چلو گی دیکھنے؟''

''آپ مائنڈ نہ کریں سر لیکن کل میں مصروف ہوں گی۔'' میں نے ٹائپ رائٹر سے سر اٹھایا۔

''ایک ہفتے تک لگی رہے گی نمائش۔'' اس نے میز کے ایک کونے پر ٹکتے ہوئے مزید انفارمیشن دی۔

''گھر جا کر میں کچھ اتنی مصروف ہو جاتی ہوں کہ پھر میرے لئے نکلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

''بہرحال یہ ان آگوریشن کا کارڈ ہے وقت ملے تو آجانا۔'' اس نے کارڈ میز پر رکھ دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کارڈ اٹھا کر دیکھا جس کی پیشانی پر خوبصورت لکھائی میں میرا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے کارڈ میز کی دراز میں رکھ دیا، جانا تو تھا نہیں پھر خوامخواہ

کمٹمنٹ کرنے کا کیا فائدہ تھا۔

آفس کی باقی لڑکیوں کو بھی اس نے کارڈ دیئے تھے اور اس دن چائے کے وقفے میں لڑکیوں کے درمیان یہی تقریب موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ کپڑوں کا انتخاب، میچنگ نیل پالش، کپڑوں کے ساتھ کے جوتوں کی عدم دستیابی وغیرہ۔ لیکن سب سے دلچسپ پریشانی افشاں کی تھی۔

''میں نے آج تک مصوری کے متعلق ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔''

''لیکن ایسی کوئی کتاب پڑھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' نسیمہ نے پوچھا۔

''رعب نہیں ڈالنا کہ مجھے بھی مصوری کے متعلق اچھا خاصا علم ہے۔'' افشاں ہنسی۔

''تمہارا رعب حسن کافی نہیں ہے؟'' شکیلہ بولی۔

''کاش کافی ہوتا۔'' اور اس کی بات پر سب ہنس پڑیں۔

چند دن بعد انیس پھر آفس آ دھمکا۔

''تمہیں پورے ہفتے میں ایک گھنٹہ بھی ایسا نہیں ملا جس میں میری تصویروں کی نمائش دیکھ سکتیں۔'' اس نے شکوہ کیا۔

میں نے ایک نظر اسے دیکھا اس کا So What انداز اور Who Cares رویہ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے اب یکسر تبدیل ہو جاتا تھا۔

''سر آپ میری مصروفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔'' میں نے ٹائپ رائٹر میں کاغذ ڈالا۔

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی کون سی مصروفیت تھی۔''

''میرے ابا جی اٹھ بیٹھ نہیں سکتے ناں، ان کے لئے ڈاکٹر صاحب نے کچھ ورزشیں بتائی ہیں۔ انہیں وہ کروانی ہوتی ہیں، اب شکر ہے کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ پتا ہے سر وہ سارا دن کھاٹ پر خاموش لیٹے رہتے ہیں اور ماں جی بھی گھر کا کام کاج نمٹا کر ان کے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں ان دونوں کو خاموشی سے وحشت اور گھبراہٹ کیوں نہیں ہوتی مجھے بہت ہوتی ہے۔ پھر میں ان سے باتیں کرتی ہوں، کچھ ماں جی کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔ ابا جی کو اخبار اور رسالے پڑھ کر سناتی ہوں، رات کو اپنا پڑھتی ہوں بس اسی میں وقت گزر جاتا ہے۔''

''تمہارے ابا جی اور اماں جی اس لئے باتیں نہیں کرتے کہ اب انہیں اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کی خاموشی میں الفاظ سے زیادہ رنگ ہیں اور تمہیں سناٹے سے اس لئے وحشت ہوتی ہے کہ تمہیں ابھی سناٹے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری عمر میں سبھی کو لفظوں سے، رنگوں سے محبت ہونی چاہئے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم بولتی کب ہو؟ میں تو تمہیں چپ چاپ کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میری دوستی صرف ماں جی اور ابا جی سے ہے اور ان کے ساتھ میں بہت باتیں کرتی ہوں۔''

تھوڑی دیر کے توقف کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے تم میں امید، عزم اور معصومیت کا ایسا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے جس سے تمہاری ساری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ میں تمہاری شخصیت کے اس عزم، امید اور معصومیت کو پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سکریل پیڈ کے ورق پلٹتے پلٹتے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''اور اسی لئے میں چاہتا تھا کہ تم میری تصویروں کی نمائش دیکھو تاکہ تمہیں اندازہ ہو سکے کہ میرا کام کیسا ہے۔''

''مجھے آرٹ کا زیادہ علم تو نہیں ہے لیکن میرے خیال میں ایک چیز تجریدی آرٹ بھی کہلاتی ہے۔''

''بالکل۔''

''اور اس میں کوئی Definite یا حقیقی شکل نہیں بنائی جاتی بس رنگوں کے ذریعے اظہار کیا جاتا ہے۔''

''ہاں کسی حد تک یہ کہہ سکتے ہیں۔''

''تو سر آپ تجریدی آرٹ میں امید، عزم اور معصومیت کو پینٹ کر دیں۔''

''نہیں میں یہ سب تاثرات تمہارے چہرے کے ساتھ کینوس پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، انٹر کام کا بزر بج اٹھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

''سعدیہ بی بی انیس آپ کے پاس ہے؟'' شاہ صاحب کی آواز ابھری۔

''جی سر وہ یہیں ہیں۔''

''اسے میرے آفس بھیج دیجئے۔''

''رائٹ سر۔'' میں نے ریسیور واپس رکھ دیا اور پھر اس سے مخاطب ہوئی۔ ''سر آپ کو شاہ صاحب بلا رہے ہیں۔''

''اوکے پھر تم سے کل بات ہوگی۔''

سارا دن میں اسی شش و پنج میں رہی کہ انیس شاہ کو کیا جواب دوں۔ سب سے پہلے تو مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ اپنی تصویر کے لئے اس نے مجھے کیوں چنا تھا۔ مجھے تو خود میں کبھی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی۔

اس رات اسی سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے میں نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ یوں ہی عام زرد سا چہرا، میرا رنگ صاف ہونے کے باوجود اس پر کبھی بھی صحت کی سرخی اور شادابی نہیں جھلکی تھی۔ میرے چہرے پر ہمیشہ زردیوں نے ڈیرے ڈالے رکھے تھے، بالوں پر ہمیشہ تیل لگا رہتا تھا کیونکہ ماں جی کا خیال تھا کہ شدید ذہنی مشقت کے بعد اگر میں نے تیل نہ لگایا تو میرا دماغ خشکی کا شکار ہو جائے گا لیکن میرے یہ تیل لگے لمبے بال ہمیشہ بڑی سی موٹی چادر کے نیچے چھپے رہتے تھے۔ جو میں نے سر کے علاوہ ماتھے پر بھی اچھی طرح جما کر رکھی ہوتی تھی۔

''اونہوں' مجھ میں ایسی کوئی بھی خاص بات نہیں ہے جس کی وجہ سے مجھے پینٹ کیا جائے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا اور سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی۔

''لیکن انیس شاہ سے انکار کس طرح کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' میں نے دل میں سوچا۔ ''ایک تو مسئلہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں میں کسی سے مشورہ بھی نہیں لے سکتی۔ ماں جی کی دنیا اتنی محدود ہے کہ انہیں اس بات کی خبر بھی نہیں ہوگی کہ پینٹنگ کس چیز کا نام ہے اور ابا جی بی سی ایسے ماحول سے واقفیت ہی نہیں ہے۔ خیر جو ہوگا صبح دیکھا جائے گا ہو سکتا ہے وہ یہ بات کر کے بھول بھی گیا ہو۔''

لیکن انیس شاہ یہ بات نہیں بھولا تھا۔

''پھر کب دے رہی ہو وقت؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''سر مجھے افسوس ہے میں آپ کو وقت نہیں دے سکوں گی۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''یہاں سے جانے کے بعد جتنا وقت بچتا ہے، وہ میرے ابا جی اور ماں جی کے لئے ہوتا ہے۔ یوں بھی میری غیر موجودگی میں وہ مجھے بہت مس کرتے ہیں۔''

''مجھے زیادہ وقت نہیں چاہئے ہوگا، بس ایک ہفتے کی بات ہے روزانہ ایک گھنٹہ۔''

''میں نے کہا ناں سر کہ میرے لئے ممکن نہیں ایک منٹ بھی نہیں۔'' ڈپلومیسی سے کام لینا میری عادت نہیں تھی، یہ جو تھوڑی بہت ڈپلومیسی مجھے آ گئی تھی وہ اس عملی دنیا میں قدم رکھنے کا نتیجہ تھی لیکن زیادہ دیر تک یہ میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس وقت بھی میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

چند ثانیے تک انیس شاہ گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کندھے اچکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد میں چند فائلیں لے کر شاہ صاحب کے آفس میں پہنچی تو وہ تو وہاں نہیں تھے لیکن انیس شاہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا سے بیزار ہو۔ اس کی کرسی کے ساتھ والی تپائی پر کیسٹ پلیئر پڑا ہوا تھا اور موسیقی کی مدھم مدھم لہریں پورے کمرے میں پھیل رہی تھیں۔

''سورج کبھی مکھڑا تیرا۔ چمکا دے تو جیون میرا''

میں نے چپ چاپ فائلیں میز پر رکھیں اور واپس مڑنے لگی۔

''سعدیہ۔''

اس کی آواز نے میرے قدم روک دیئے۔

''جی سر۔''

''بیٹھو یہاں۔'' اس نے بٹن دبا کر کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔

''سر مجھے کام ہے۔'' میں جلدی سے واپس جانا چاہتی تھی مبادا وہ پھر تصویر کا ذکر چھیڑ دے اور میرے سختی سے انکار کرنے کی صورت میں مجھے اتنی اچھی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ میں اس قابل تھی کہ میری تصویر بنائی جائے اور جب تک میں یہ نہ

سمجھ لیتی کہ اس کے باوجود انیس شاہ میری تصویر کیوں بنانا چاہتا ہے، تب تک میں ہامی نہیں بھر سکتی تھی۔ یہ بات میری طبیعت کے ہی خلاف تھی کہ میں سوچے سمجھے بغیر کسی کام کی ہامی بھر لوں۔ میں اس لئے وہاں زیادہ دیر تک رکنا نہیں چاہتی تھی کہ میں ایسا کوئی موقع آنے ہی نہیں دینا چاہتی تھی جس سے اختلاف کی کوئی صورت ابھرے لیکن جب ناؤ سمندر میں ڈال دی جائے تو بھنور راہ میں آتے ہی ہیں۔ مجھے بھی ایسے ہی بھنور دکھائی دے رہے تھے اور میں اپنی ناؤ کو ان سے بچانا چاہتی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں کام ہے اور یہ بھی کہ تمہیں سارا وقت خود کو کام میں الجھائے رکھنے کا شوق ہے لیکن یہ کام تم فیکٹری کے لئے کر رہی ہو اور میں فیکٹری کا مالک ہوں۔ اگر میں تمہیں رکنے کا کہہ رہا ہوں تو کام کا بہانہ کیسا۔''

''سوری سر!'' میں مالکوں کو اس قدر ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تمہیں کوئی پرابلم ہے کیا؟ اتنی کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں دل میں حیران تھی کہ جب واقعی کھنچی ہوئی رہتی تھی میں تب انہوں نے کچھ نہیں کہا اور اب جب ایسا نہیں تھا تو انہوں نے یہ محسوس کیا تھا۔

''میں تمہیں تھوڑا سا اضافی کام دینا چاہتا تھا اگر تم کر سکو تو۔'' اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

''آپ کہیں سر۔''

''مجھے ایک اخبار میں آرٹ سے متعلق ہفتہ وار آرٹیکل لکھنا ہوتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو وہ ٹائپ کر دیا کرو میں تمہیں لکھا ہوا دے دیا کروں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' ٹی بریک میں مَیں ایک کتاب سے ٹائپنگ کی پریکٹس کیا کرتی تھی، اس لئے آرٹیکل ٹائپ کرنا میرے لئے مسئلہ نہیں تھا۔

''اب میں جاؤں سر؟'' چند ثانیے اس کے بات کرنے کا انتظار کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''جاؤ۔''

پھر اس نے آرٹیکل دینے میں دیر نہیں لگائی۔ اگلے ہی دن بڑے کاغذوں کا ایک دستہ میرے حوالے کر دیا۔

''یہ ٹائپ کرنا ہے چاہے تو تین دن لگا لو لیکن اس سے زیادہ نہیں۔''

میں نے ایک نظر کاغذوں کی جانب دیکھا، اس کی لکھائی اتنی خوبصورت اور صاف تھی کہ میں دیکھتی رہ گئی۔

''سر اسے ٹائپ کرانے کی کیا ضرورت ہے یہ تو ویسے ہی اتنا اچھا لکھا ہوا ہے۔''

''اچھا تو ہے لیکن اخبار میں چھپنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ٹائپ شدہ ہو۔'' وہ مسکرایا۔

''ٹھیک ہے میں کر دوں گی۔''

آرٹیکل ٹائپ کرتے ہوئے آدھا میری سمجھ میں آیا اور آدھا سر پر سے گزر گیا اور پھر تین چار ایسے ہی آرٹیکل میں نے ٹائپ کر دیئے تو ایک دن وہ میرے پاس چلا آیا۔

''یہ لو۔'' اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟''

مجھے آرٹیکل لکھنے کے پیسے ملتے ہیں اور تم انہیں ٹائپ کرتی ہو اس لئے اصولاً تمہیں بھی اس میں سے حصہ ملنا چاہئے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں جلدی میں بولی۔ ''یہ تو میں ٹی بریک میں کرتی ہوں اور اس کا مجھے ہی فائدہ ہے میری سپیڈ بڑھتی ہے۔''

''پھر بھی بیگار تو ہے ناں یہ۔''

''سر آپ یقین کریں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تمہیں گھر کے لئے بھی تو ضرورت رہتی ہے اس کے لئے رکھ لو۔''

''اب تو میری تنخواہ بھی بہت اچھی ہے اور اس سے گھر کا بخوبی گزارا ہو جاتا ہے بلکہ بچ بھی جاتا ہے۔ اب ہمارے گھر میں کوئی فنانس پرابلم نہیں ہے۔ ماں جی نے کافی رقم جمع کر لی ہے، اگلے ایک آدھ سال میں ہم دکان ڈال لیں گے پھر مجھے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔''

"سوچ لو میں تو ڈھیٹوں کی طرح اور بہت سے آرٹیکل ٹائپ کراؤں گا۔"

"آپ کراتے رہیں سر، مجھے یوں بھی مصروف رہنا پسند ہے۔ یہاں تو مکھیاں بھی نہیں ہیں کہ فارغ وقت میں وہی مار سکوں۔"

"بہت اچھا۔" وہ بولا۔ "پیسے تم لے نہیں رہیں، ایسا کرتے ہیں کہ اب ان سے باہر کہیں لنچ کرآتے ہیں۔"

"لنچ کرآتے ہیں۔" میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہمارے ہاں تو مردوں سے بات کرنا گناہ عظیم تصور ہوتا تھا، کہیں باہر لنچ کرنا تو میری سوچ کی حد سے بھی باہر تھا۔ میری مجبوری نہ ہوتی تو میں یہاں کسی مرد سے بات بھی نہ کرتی۔

"ہاں کیا حرج ہے تمہارے کام کو Acknoqwledge کرنے کا یہی ایک طریقہ رہ جاتا ہے۔"

"شکریہ سر لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ نے کہہ دیا میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو میرا کام پسند آیا ہے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو؟" آج پہلی مرتبہ میں نے انیس کی آنکھوں میں حیرت دیکھی تھی۔

"پتا نہیں سر مجھے کیسے پتا ہوسکتا ہے۔" میں اس کی بات بالکل نہیں سمجھی، یہاں نہ تو اس محاورے کی کوئی تک مجھے سمجھ آئی تھی اور نہ ہی حقیقی معنوں میں یہ بات کی جاسکتی تھی، اس لئے میں گڑبڑا گئی۔

"مجھے بھلا کیا پتا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بنانے کے لئے کس جگہ سے مٹی لی تھی۔" میں نے سوچا۔ "مجھے کیا یہ تو کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا۔"

انیس شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی یا شاید وہ ہنسی تھی جسے چھپانے کے لئے اس نے منہ پھیر لیا تھا اور کھانستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

"سنا ہے انیس صاحب نے تمہیں لنچ کی دعوت دی تھی؟" تھوڑی دیر بعد افشاں میرے پاس چلی آئی۔

"جی۔"

"اور تم نے انکار کردیا؟" وہ بھی مجھے حیران حیران سی لگ رہی تھی۔

"جی۔" میں نے پھر مختصراً کہا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تو لنچ کی بھی کوئی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "چند آرٹیکل ہی ٹائپ کئے ہیں۔ ایسا کون سا کارنامہ کیا ہے جس کا انعام دینا ضروری ہو، یوں بھی ٹائپ کرنا تو میری ملازمت کا حصہ ہے۔"

"پاگل ہو تم۔" وہ آہستہ سے کہہ کر میری میز کے پاس سے ہٹ گئی۔

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟" میں سوچنے لگی۔

"کیا سچ مچ اس نے لنچ سے انکار کردیا ہے؟" حمیرا کی میز کے گرد جمع لڑکیوں نے تبصرہ شروع کردیا۔

"ہاں۔"

"بے حد بیوقوف ہے۔"

"بیوقوف نہیں ہے۔" حمیرا ہنسی۔ "اس کی دھلی دھلائی اخلاقیات ٹیکسٹ بک بورڈ کی میٹرک کی کتابوں سے نکلی ہوئی ہے، اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جب میں فائلیں لے کر شاہ صاحب کے آفس میں پہنچی تو وہ حسب معمول فائلوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے جبکہ انیس شاہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا واک مین سن رہا تھا۔ میں نے فائلیں میز پر رکھ دیں۔

"اب تو کوئی پرابلم نہیں ہے؟" شاہ صاحب نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"بالکل نہیں میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ سعدیہ میری فیکٹری میں آجائے۔" انیس شاہ نے ہیڈ فون کانوں سے اتارا۔ "کم از کم شروع میں تو میری فیکٹری کو اچھے ورکرز ملنے چاہئیں۔"

"کیوں سعدیہ جانا چاہو گی؟" شاہ صاحب نے پائپ سلگایا۔

"سر میں یہاں ایڈجسٹ ہوگئی ہوں، یہ ماحول میرا دیکھا بھالا ہے میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔"

شاہ صاحب کے ہونٹوں پر مہربان مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اور کسی کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن سعدیہ کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں رہنا پسند کرے گی۔''

''میں تمہاری تنخواہ بڑھا دوں گا۔'' انیس نے فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔

''سر میں یہاں سے واقعی نہیں جانا چاہتی۔'' میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

''میں بہت خوش ہوں یہاں اور یہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

انیس شاہ کیا چاہتا تھا کہ یہ اس وقت میری سمجھ سے باہر تھا۔ مجھ سے بھی اچھے ورکرز تھے فیکٹری میں، پھر وہ مجھے ہی کیوں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

اس دن جمعہ تھا، فیکٹری میں آدھا دن تھا۔ تب چھٹی اتوار کے روز ہوا کرتی تھی۔ ساڑھے بارہ ہونے والے تھے اور میں گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ انیس شاہ آ گیا۔

''جانے لگی ہو کیا؟''

''یس سر۔''

''اتنی جلدی ابھی تو.....'' اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ''ابھی تو صرف ساڑھے بارہ ہوئے ہیں۔''

''آج آدھا دن ہے۔'' میں نے یاد دہانی کرائی۔

''اوہو!'' اسے جیسے ایک دم یاد آیا۔

''کوئی کام تھا سر؟''

''ہاں تھا تو سہی لیکن تمہاری چھٹی کا وقت ہو رہا ہے۔''

''ابھی پانچ منٹ ہیں آپ بتائیں شاید میں کر سکوں۔''

''یہ آرٹیکل فوری طور پر ٹائپ کرنا تھا لیکن اس میں پانچ منٹ نہیں زیادہ وقت لگے گا۔''

''بہت ضروری ہے سر؟''

''ہے تو بہت ضروری۔''

''تو لائیں میں ٹائپ کر دیتی ہوں، اب تو میری سپیڈ بھی ستر الفاظ فی منٹ ہوگئی ہے۔''

''تمہیں گھر سے دیر ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں میں گھر پہنچ کر ماں جی کو بتا دوں گی۔''

اس نے کاغذوں کا دستہ مجھے تھما دیا۔ واقعی خاصا لمبا کام تھا لیکن میں نے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ سعدیہ کام چور ہے۔ یوں بھی پرائیویٹ نوکری تھی جہاں مالک کا حکم ہر حال میں ماننا پڑتا تھا۔ بس اسی لئے کاغذ مشین پر چڑھا کر ٹائپ کرنے لگی۔ ایک ایک کر کے سبھی گھر کے لئے نکلنے لگے۔

''سب کی چھٹی اسی وقت ہو جائے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔'' میں نے تیزی سے کی بورڈ کے حروف پر انگلیاں چلائیں۔

''اس طرح تو تم اکیلی رہ جاؤ گی یہاں۔''

''سر اپنی جگہ ہے اپنی جگہ پر کون اکیلا رہتا ہے۔''

''چلو میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں تمہیں کمپنی مل جائے گی۔''

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور بدستور اپنے کام میں مصروف رہی۔ انیس شاہ نے میز پر رکھے کاغذوں پر قلم سے کچھ بنانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ہر طرف خاموشی چھا گئی، بس ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک تھی جو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

''سعدیہ!'' انیس نے ٹک ٹک کی مونوٹنس آواز کو توڑا۔

''جی'' میری نظریں اب بھی کاغذ پر تھیں اور انگلیاں کی بورڈ پر۔

''یہ کیسا بنا ہے؟'' اس نے اپنے سامنے رکھا ہوا کاغذ میری طرف بڑھایا۔

کاغذ پر میرا کوئیک اسکیچ (Quick sketch) بنا ہوا تھا، میں نے کسی قدر حیرت سے آنکھیں اٹھائیں۔

''کیوں اچھا نہیں لگا؟''

''بہت اچھا ہے سر!'' میں نے کاغذ دوبارہ رکھ دیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

''پتا نہیں تم حد سے زیادہ بیوقوف ہو یا کیا بات ہے کہ اب تک نہیں سمجھیں، حالانکہ اس میں سمجھنے کی بات ہی نہیں ہے۔'' میں نے ایک لمحے کے لئے حیرت زدہ نظروں سے اسے

دیکھا آج وہ عجیب وغریب باتیں کر رہا تھا لیکن میں پھر ٹائپ کرنے میں مصروف ہوگئی، کیونکہ میں جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔

''تم اتنی ناقابل حصول کیوں ہو؟'' اس نے غصے میں ٹائپ رائٹر سے کاغذ کھینچ نکالا۔

میں نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں سر۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی لڑکی یہ بات سمجھنے سے قاصر بھی ہوسکتی ہے۔'' وہ جھنجھلا گیا۔ ''سیدھے لفظوں میں یہ کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟'' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انیس شاہ اس وقت مجھ سے یہ بات کرے گا۔

''ہاں۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

''لیکن سر آپ تو شادی شدہ ہیں۔'' اس جھٹکے سے ابھی تک میرے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے اس لیے ٹپٹا کر بولی۔

''ہاں شادی بھی ایک راستہ ہے اچھا ہو کہ تم اس پر راضی ہو جاؤ۔''

''ایک راستہ؟'' میں نے دل میں سوچا۔ ''وہی تو واحد راستہ ہے کسی بھی لڑکی کو حاصل کرنے کا۔''

''کرنا چاہو گی مجھ سے شادی؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے آپ تو شادی شدہ ہیں سر۔'' مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو اسے قائل کرنے کے لئے دوبارہ یہی دلیل دی۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں تمہیں الگ رکھوں گا۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی تمہیں۔ شادی کے وقت مکان اور گاڑی کے کاغذات تمہارے ہاتھ پر رکھوں گا۔'' پھر وہ قدرے توقف سے گویا ہوا۔ ''یوں بھی اپنی بیوی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ شادی صرف اس لئے ہوئی تھی کہ ہمارے خاندان میں لڑکی کی شادی کہیں باہر نہیں ہوسکتی اور نرگس کے لئے قربانی کا ایک میں ہی بکرا تھا۔ سو میرے گلے پر چھری پھیر دی گئی۔ میں نے اسی وقت اپنے اماں ابا کو بتا دیا تھا کہ نرگس میری پسند نہیں ہے۔ محض گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے جسے بجانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ میرا ارادہ دوسری شادی

کرنے کا ہے۔''

''بہتر ہوگا سر آپ اپنے گھر میں سکون تلاش کریں۔ ہمارے ہاں بھی رشتے باہر نہیں دیئے جاتے اس لئے بھول جائیں اس بات کو جو ابھی آپ نے کی ہے۔''

''تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟ یہاں کی کون سی لڑکی ہے جو مجھے حاصل نہیں کرنا چاہتی۔''

''جو لڑکیاں یہ چاہتی ہیں آپ کو انہی کے پاس جانا چاہئے کیونکہ مجھے ہرگز آپ سے محبت نہیں ہے۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی میرے لہجے میں سختی تھی۔ ''راستے میں چلتے ہوئے بہت سے ایرے غیرے نتھو خیرے ملتے ہیں اور میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے کہ ان سب سے محبت کرتی پھروں۔ آپ انہی ایروں غیروں نتھو خیروں میں سے ایک ہیں، گھر میں بیوی ہے اور محبت کرنے کے لئے باہر تاکتے جھانکتے ہیں، شرم آنی چاہئے آپ کو۔''

میں بیگ اٹھا کر باہر جانے لگی لیکن انیس نے ٹانگ آگے کر کے میرا راستہ روک لیا۔

''کیا سمجھتی ہو تم خود کو؟ اتنی ناقابل حصول بھی نہیں ہو تم۔ شادی تو صرف ایک راستہ تھا حصول کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔'' وہ عین میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''ہٹ جائیں میرے راستے سے مجھے گھر جانا ہے۔'' میں نے کنی کترا کر نکلنا چاہا لیکن اس کے مضبوط ہاتھ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

''تم کہیں نہیں جارہیں؟''

''مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے خواہ اس کے لئے مجھے نوکری سے ہی کیوں نہ جواب مل جائے۔'' میں واقعی بہت بیوقوف تھی جواب تک یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ شادی کے سلسلے میں مزید مذاکرات چاہتا ہے۔

''جاسکو تو چلی جاؤ۔'' اس نے ایک جھٹکے سے مجھے کرسی پر پٹخا۔

''آ۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ مجھے جانے دیں۔'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

لیکن اس کے بعد میری تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ اتنے روشن کمرے میں میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ بالکل اماوس کی رات کی طرح جس میں کوئی ستارہ کوئی جگنو نہیں تھا۔ تاریک گھٹا ٹوپ اندھیرے والی رات کی مانند۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ کوئی

عفریت میری جانب بڑھا تھا شاید کرسی بھی گری تھی اور میں نے بھاگنے کی بھی کوشش کی تھی۔
لیکن پہلے میری چادر کہیں اٹکی تھی اور میں اسے چھوڑ کر بیرونی دروازے کی طرف لپکی تھی۔
لیکن پھر نہ جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر گری تھی اور اس ایک ٹھوکر نے میری آنے والی ساری زندگی برباد کر دی۔

☆======☆======☆

کہر میں ڈوب گئی تھیں شمعیں
وقت ناراض تھا قسمت کی طرح
رات کے رخ پہ تھے زخموں کے نشاں
میری مجروح حمیت کی طرح !

کب کیا ہوگا میرا کم عمر ذہن یہ سب سمجھنے سے قاصر تھا۔ مجھے تو یہ یاد ہے کہ میں اماں جی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ تو جیسے سکتے کی کیفیت میں تھیں۔ اب سے پہلے میں نے قیامت کا نام صرف لوگوں کے منہ سے سنا تھا یا پھر اسلامیات کی کتابوں میں پڑھا تھا لیکن درحقیقت قیامت کسے کہتے ہیں اس کے متعلق مجھے اس وقت پتا چلا جب یہ مجھ پر ٹوٹی تھی۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ مجھے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان ایک رشتہ شوہر اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے اسے اتنی کم عمری میں میں نہیں سمجھ سکتی تھی اور پھر یہ تو صرف مرد اور عورت کا تعلق تھا۔ جس میں مرد قوی اور طاقتور اور عورت بہت بے بس اور کمزور ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے فقط یہ پتا تھا کہ میرے ساتھ بہت غیر انسانی اور ظالمانہ سلوک ہوا ہے۔

''آنسو بننے کے بعد مگر گرنے سے پہلے
روشنی کو بھی پتھر کر دیتے ہیں
میں تو تہوں سے ہنستی ہوئی اُبھری تھی
میں تو خود کو پا لینے اور فراموش کرنے کی
ساری قوتیں اپنی مٹھی میں رکھتی تھی
جس رات کو گونجنے والی چیخ کی طرح

کہیں کسی نے ڈائنامائٹ سے پہاڑ میں
راستہ پیدا کیا ہے
اور مجھے بتایا ہے کہ
اندھے کی طرح روشنی میرا مقدر نہیں''

کتنے دن تک میں اپنے کمرے میں بند رہی۔ سونا، جاگنا کسی سے نگاہ ملا کر بات کرنا بھی کچھ میرے لئے ناممکن ہو چکا تھا۔ مجھے خود احساس نہیں ہوتا تھا کہ کب میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور کب میں نے سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کیا۔ ہر نئے دن کا سورج میری تکلیف اور دکھ کے احساس کو بڑھاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے روشندان اور کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی کرنیں بھی میرا مذاق اُڑا رہی ہوں۔ جیسے وہ اس سانحے سے باخبر ہوں جو مجھ پر بیت چکا تھا۔ مجھے خود سے گھن آنے لگتی اور میں ایک جھٹکے سے گہرے رنگ کے پردے کھڑکیوں پر گرا کر کمرے میں تاریکی پھیلا دیتی۔ تھوڑی دیر تک اس تاریکی میں گہرے سانس لیتی اور پھر اپنے بستر پر بیٹھ جاتی لیکن یہ تاریکی بھی مجھے سکون پہنچانے میں ناکام رہتی تھی۔ اندھیرے میں کمرے کی ہر چیز مجھ پر قہقہے لگانے لگتی تھی، جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں کہ روشنی کو کون بیڑیاں ڈال سکا ہے۔

یہ قہقہے تھمتے تو ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک بیدار ہو جاتی۔'' دو ہولناک آنکھیں میرے قریب آ جاتیں پھر جیسے زلزلہ آ جاتا۔ قہقہے، چیخیں، سسکیاں، اندھیرا بڑھتا جاتا۔ ماں جی دوڑ کر کمرے میں آتیں لیکن مجھے سنبھالنے کی بجائے گم صم کھڑی کی کھڑی رہ جاتیں۔ نہ جانے کب روتے روتے میں سو جاتی، پھر رات میں کسی پہر یہ سب خواب کی صورت میں دکھائی دینے لگتا۔ میری چادر اٹک کر کہیں دور رہ جاتی اور میں ٹھوکر کھا کر فرش پر گر جاتی، تب میری آنکھ کھل جاتی۔

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کبھی نہیں ہو سکتا۔'' میں چیختی اور پھر ماں جی کے کندھے سے سر ٹکا کر بری طرح رونے لگتی۔

لیکن آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ جو میں سمجھتی تھی کہ نہیں ہو سکتا وہ ہو چکا تھا اور تب ایک گہری چپ میرے ہونٹوں پر چپک کر رہ گئی۔

کتنے دن بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکلی، بالکل چوروں کی طرح جیسے یہ میرا گھر نہ ہو اور دبے پاؤں برآمدے کے گول ستون سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔ باہر صحن میں ابا جی کی چارپائی پڑی ہوئی تھی، میں انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں جو چند گھنٹوں ان سے جدائی برداشت نہیں کرسکتی تھی اتنے دن تک ان سے دور رہی تھی۔ یہاں ستون کے ساتھ کھڑے ہوکر میں بخوبی ان کی چارپائی دیکھ سکتی تھی۔ وہ اب بھی وہاں لیٹے ہوئے تھے اور اماں جی اپنی مخصوص پیڑھی پر ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں شاید باتیں کر رہے تھے، آواز اس قدر دھیمی تھی کہ سنائی دینا مشکل تھا۔ کتنی دیر تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے اور میں کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ پھر ماں جی نے ابا جی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیئے، میں نے پہلی مرتبہ انہیں اس طرح باتیں کرتے دیکھا تھا۔ نور اور روشنی کا ایک ہالہ تھا جس نے انہیں محصور کر رکھا تھا۔ کتنا میٹھا رنگ تھا محبت کا، ہولناکی اور شیطانیت سے کوسوں دور، پاکیزہ اور معطر سا میں نے آنکھیں بند کرلیں، دو آنسو میرے گالوں پر لڑھک آئے۔

''پتا نہیں اتنے دن ابا جی نے ورزش بھی کی ہوگی یا نہیں۔'' میں نے سوچا۔ ''اب تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں بھی ہلا لیتے تھے اور سہارے کے ساتھ بیٹھ بھی جاتے تھے۔ کاش ابا جی کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا۔ پھر مجھے بھی یوں گھر سے نکلنا پڑتا اور یہ سب نہ ہوتا جو ہوگیا ہے۔''

''سعدیہ!'' میرے قریب سے ماں جی کی آواز ابھری تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''اپنے ابا جی کے پاس نہیں چلو گی؟''

میں نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا، انہوں نے میرا ہاتھ ہاتھ تھام لیا۔

''چلو تمہیں تمہارے ابا جی بلا رہے ہیں۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''میں نہیں جاؤں گی ان کے پاس۔''

''وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں سعدیہ۔''

''نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گی کس منہ سے ان کا سامنا کروں گی مجھے خود سے گھن آتی ہے۔''

''بیٹی چلی جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمام عمر پچھتانا پڑے۔'' ماں جی کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''سعدیہ!'' ابا جی کی نحیف آواز ابھری۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔'' میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''میں ان کا سامنا نہیں کرسکتی کبھی نہیں کرسکتی۔'' میں اُلٹے قدموں اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

ماں جی مایوس ہوکر ابا جی کی چارپائی کی طرف بڑھ گئیں اور پھر ان کی چیخ نے میرے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ میں بھاگ کر صحن میں آئی، لیکن سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ سوائے اس پچھتاوے کے جو ساری زندگی کے لئے میرا مقدر ہوگیا تھا۔ چارپائی پر ابا جی کا صرف جسم تھا، سانس کی وہ ڈور جس سے جسم اور روح کا ناتا بندھا رہتا ہے ٹوٹ گئی تھی۔ ابا جی اپنے سبھی دکھوں کے ساتھ منوں مٹی تلے چلے گئے تھے۔ وہ جنازہ نہیں تھا، ہمارے گھر کی بچی کھچی تمام مسرتیں، خواہشیں اور حوصلے تھے جنہیں مٹی تلے دفن ہونا تھا۔ واقعی یہ پچھتاوا کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکا کہ اس دن میں ابا جی کے پاس نہیں گئی تھی۔ لیکن کبھی سوچتی ہوں کہ اچھا ہی ہوا رخصت ہوتے وقت ان کے ذہن میں میری وہی پرانی معصوم، سادہ اور خوشیوں کے جھلملاتے عکس والی تصویر ہوگی۔

جس دن جنازہ اٹھا اس دن سرگوشیاں ہوئیں، اگلے دن دبی دبی گفتگو لیکن سوئم پر باقاعدہ تبصرہ بازی شروع ہوگئی۔

''ہائے بیچارا بیٹی کے غم نے مار دیا۔''

''غیرت والا تھا اس لئے مرگیا، وہ ویسے ہی مزے میں ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔''

''میں نے تو کہا تھا کہ آج کل زمانہ خراب ہے مت بھیجو بیٹی کو نوکری پر۔ جلدی سے کوئی رشتہ ڈھونڈو اور ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کرو لیکن بہن جٹھانی دیورانی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے انہوں نے تو صاف ہی انکار کردیا۔ یہ جو اس کی چھوکری ہے اسے اتنا معصوم نہ سمجھنا۔ بڑی گھنی ہے کہنے لگی کہ دس روپے روز کے حساب سے دو تو گھر بیٹھ جاؤں گی ورنہ اپنا راستہ ناپو۔ اب خود کہو بہن، عرفان کے ابا کی تنخواہ اتنی قلیل ہے وہ کہاں سے دس روپے روزانہ کے

بھرتے پھریں۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ پہلے ہی یہاں آ کر عزت دو کوڑی کی ہوگئی ہے اب جو بچی کھچی عزت ہے اسے سنبھالیں اور آئندہ ان کے منہ نہ لگیں، پر کیا کریں خوشی غمی پر تو آنا ہی پڑتا ہے۔''

''لڑکی کے ہاتھ میں پیسے آجائیں تو اس کی زبان قینچی کی طرح تیز ہو جاتی ہے۔ توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے کیوں نہ ہو بیسویں صدی ہے صاحب۔''

''اور بہن مجھے تو لگتا ہے کہ ساری کہانی ڈھونگ ہے۔'' تائی جی نے راز داری کا مظاہرہ کچھ اس انداز میں کیا کہ آواز بھی نیچی ہو جائے اور ان کے اردگرد بیس پچیس عورتوں کا جو گھیرا لگا ہوا تھا ان سب کی سماعت تک بھی پہنچ جائے۔

''کیسا ڈھونگ؟'' چاچی جی بھی قریب سرک آئیں۔

''شکل سے یہ بالشت بھر کی لڑکی جتنی معصوم دکھائی دیتی ہے اتنی ہے نہیں۔ ضرور کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائی ہوں گی پھر اس کا انجام تو یہی ہوتا ہے۔ مرد کون سی قابل اعتبار ہستی ہے جو لڑکی خود کو بنا سنوار کر اسے پیش کرے گی اسے ہاتھ بڑھانے سے کون روک سکتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے میری بھی دو بیٹیاں ہیں، مجال ہے جو کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیں۔''

''بس جی جوانی اندھی ہوتی ہے۔'' مامی جی نے گہرا سانس لیا۔

''کیوں جی ہماری بیٹیوں پر جوانی نہیں آئی کیا؟ یہ تربیت کی بات ہوتی ہے۔'' تائی نے مامی جان کی بات کو فوراً مسترد کیا۔ ''بھئی آپ لڑکی کو گھر سے نوکری کے لئے نکالیں ہی کیوں؟ میرے میاں تو بہت معیوب سمجھتے ہیں بیٹی کی کمائی کھانا، کہتے ہیں بھوکا مر جاؤں گا لیکن بیٹی کی کمائی کا لقمہ تک نہیں نگلوں گا۔''

میں اپنے کمرے میں چلی آئی، آنسو مسلسل میرے گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔

''تائی جی آپ کو کیا پتا بھوک کسے کہتے ہیں، اس کا عفریت انسان کو کیسے جکڑتا ہے۔''

میں نے سوچا میں کس کے سامنے صفائی پیش کروں؟ میرا قصور کیا تھا؟ میں کب بنی سجی تھی؟ مجھے تو محبت کے اس مفہوم سے واقفیت بھی نہیں تھی جس کی تائی جی نے پوری کہانی گھڑ لی تھی۔

خدایا میں کیا کروں؟ تُو نے وہ بوجھ میرے کندھوں پر کیوں ڈال دیا ہے جو مجھے ساری زندگی

اٹھانا ہے لیکن جسے اٹھانے کی مجھ میں سکت نہیں ہے؟ مجھے موت کیوں نہ آگئی؟ یہ زہریلی روح کو چھیدنے والی باتیں سن کر بھی میں زندہ ہوں، کیوں زندہ ہوں؟ اس بے وقعت بے مقصد زندگی کو جیئے جانے کا فائدہ؟

میں بستر پر پڑے کتنی دیر تک سوچتی رہی، باہر برتنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں چشم تصور سے دیکھ سکتی تھی کہ باہر پلاؤ کی دیگ خالی ہونے والی ہوگی۔ دوسری دیگ کے پیندے میں جو بچا کھچا شوربہ ہوگا اس میں گوشت کا ایک ٹکڑا بھی موجود نہیں ہوگا۔ زردے کی دیگ پر تنقید ہورہی ہوگی کہ میٹھا زیادہ ہے یا کم، چاول کھلے کھلے نہیں ہیں، کشمش بادام تو نام کو بھی نہیں ہیں۔

تائی جی کے سامنے کلمے کی گٹھلیوں کا ڈھیر مسلسل اور لگاتار باتوں کے باوجود بڑھتا جارہا تھا اور مامی جی جو پوری تندہی سے یہ باتیں سننے میں مصروف ہوں گی۔ ہر دس منٹ بعد ایک سپارہ بند کر کے دوسرا اٹھا لیں گی اور اٹھنے سے پہلے یہ کہہ کر سب پر اپنی مسلمانی کی دھاک بٹھائیں گی۔

''پورے پندرہ پارے پڑھے ہیں میں نے، بس جی جسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ہمت دیتا ہے۔ ورنہ جن کا قریب رشتہ تھا وہ تو پڑھنے کے لئے پاس بھی نہیں آئے۔''

پھر تائی جی، چاچی پر فقرہ کسیں گی۔ ''ہمت اور توفیق تو یہاں بیٹھے ہوئے بھی بہت سے لوگوں کو نہیں ہے۔''

جس پر چاچی فوراً صفائی پیش کرنے کے لئے گود میں ریں ریں کرتے منے کو تھوڑا سا اٹھا کر سب خواتین میں اس کی نمائش کریں گی۔

''کیا کروں گود کا بچہ ہے فوراً کپڑے ناپاک کر دیتا ہے۔''

''لعنت ہو ان سب پر ایک ایک پر۔'' میں تکیے میں منہ چھپا کر بڑبڑاتی اور آنسو ایک مرتبہ پھر رواں ہوگئے۔

جیسے جیسے اندھیرا اترتا آرہا تھا ویسے ویسے صحن سے آنے والی آوازیں بھی ختم ہوتی جارہی تھیں۔ بالآخر جب اتنی خاموشی چھا گئی کہ جھینگروں کے بولنے کے علاوہ کبھی آوازیں بند ہوگئیں تو میں آہستگی سے بستر سے نکلی۔ باہر بادلوں نے آسمان کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا

اور چاند کی کوئی ننھی سی کرن بھی زمین پر نہیں پڑ رہی تھی۔ میں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

بھکاری ذہن تم ہی کچھ بتاؤ

دل دریوزہ گر کو بھیک کیا دوں؟
نہ میرے بس میں لمحے ہیں نہ رستے
میں شہر زندگی تک کیسے جاؤں؟
فصیل زندگی اور خندق جاں
نہ گرتی ہے نہ بھرتی ہے کروں کیا؟
سسکتی آرزو، زخمی تمنا؟
نہ جیتی ہے نہ مرتی ہے کروں کیا؟

میں کچن کی طرف بڑھ گئی اور ٹٹولتے ہوئے جالی والی الماری سے گوشت کاٹنے والی چھری نکال لی۔ اتنی بے عزتی کے ساتھ زندگی کا یہ طویل سفر کاٹنا مجھے ناممکن لگ رہا تھا۔ میں ہر وقت ہر لمحے غور کرتی تھی کہ میرا قصور کیا تھا؟ لیکن اب تک مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں نے غلطی کب اور کہاں کی تھی؟

شاید پہلی غلطی میں نے اس وقت کی تھی جب شاہ صاحب سے سپروائزر کی شکایت کی تھی اور پھر ایک کے بعد ایک غلطیاں سرزد ہوتی گئی تھیں۔ مٹھائی دینے جانا، بہتر ملازمت کے حصول کے لئے ٹائپنگ سیکھنا، انیس شاہ کے آرٹیکل ٹائپ کرنا اور آخری اور سب سے بڑی غلطی چھٹی کے بعد وہاں رکنے کی حماقت کرنا لیکن کیا سچ بولنا غلطی تھی؟ اپنے حق کے لئے لڑنا غلطی تھی؟ بہتر زندگی کا جائز حصول غلطی تھی؟ انسان پر اعتماد کرنا غلطی تھی؟

اگر یہ سب غلطیاں تھیں تو ان میں سے ایک بھی میں نے جان بوجھ کر نہیں کی تھی۔ یہ سب خود بخود سرزد ہو گئی تھیں۔ اور اگر یہ غلطیاں نہیں تھیں تب بھی مجرم تو مجھے ہی گردانا جا رہا تھا نا۔ انیس شاہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں تھا، ہر ایک کے منہ پر میرا تذکرہ تھا۔ پہلا زخم ہی کم تھا کہ اب سبھی نے تماش بینوں کی صورت میں اس واقعے کی جگالی شروع کر دی تھی اور سب بار بار مجھے نشتر چبھو کر اس پر نمک پاشی کر رہے تھے۔ نہیں یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں تھی، میں جرم

کے اس احساس کے ساتھ جی نہیں سکتی تھی۔ میں نے خود پر وار کرنے کے لئے چھری بلند کی اور اس کے ساتھ ہی کچن روشن ہو گیا۔ ماں جی دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔

”تمہارا باپ تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا، اب تم بھی جانا چاہتی ہو؟“ ان کی آواز میں مایوسی چیخ رہی تھی۔ ”میں تمہیں روکوں گی نہیں کیونکہ تم جس عذاب میں مبتلا ہو اسے جھیلنا آسان نہیں ہے، لیکن میں تمہاری ماں ہوں جس نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ میں بھی بہت بڑے عذاب سے گزر رہی ہوں لیکن خودکشی نہیں کر سکتی اور نہ ہی تمہارے باپ کے بعد اب تمہیں کفن میں لپٹا ہوا دیکھ سکتی ہوں۔ تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا میں نے، آج پہلی مرتبہ کچھ مانگنے لگی ہوں۔ اسے درخواست سمجھو یا حکم لیکن خدا کے لئے اسے پورا کر دو۔ اگر خود کو مارنا چاہتی ہو تو اس سے پہلے یہ چھری میرے گلے پر بھی پھیر دو۔ تمہارے ابا جی اور تمہارے بعد مجھے زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔“

میں ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھنے لگی۔

”سوچ کیا رہی ہو، میں اپنے سامنے اپنی تخلیق کو موت کے منہ میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے تو بہت ناز سے پالا تھا تمہیں، کیسے خون میں لت پت دیکھ سکتی ہوں، پہلے مجھے مارو پھر خود کو ختم کرو آگے بڑھو۔“

چھری میرے ہاتھ سے گر کر فرش پر گر گئی اور میں ماں جی کے سینے سے لگ گئی۔

ماں جی مجھے کمرے میں لے آئیں۔

”بھول جاؤ سعدیہ جو ہو چکا ہے ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔ پتا ہے تمہارے ابا جی نے فوت ہونے سے قبل کیا کہا تھا؟ وہ کہہ رہے تھے کہ میری بیٹی سے کہنا وہ اب بھی کنول کے پھول کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے۔ اس سے کہنا کہ دل چھوٹا نہ کرے، زندگی میں برے ہی نہیں اچھے لوگ بھی ملتے ہیں اور برے کم ہیں اچھے بہت زیادہ۔ اسے یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کچھ وعدہ کیا تھا، وہ وعدہ اسے ہر حال میں پورا کرنا ہے ورنہ میں اس سے ناراض ہو جاؤں گا۔“

میں خالی خالی نظروں سے ماں جی کو دیکھتی رہی۔

”وہ یہی سب کہنے کے لئے اس دن تمہیں بلا رہے تھے۔“ ماں جی نے پھر کہا۔

وہ رات ہم دونوں ماں بیٹیوں نے یونہی بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ اپنی اپنی سوچ میں گم ہو کر ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ایک دوسرے سے دور رہ کر۔

ابا جی کی وفات نے ماں جی کو توڑ کر رکھ دیا تھا وہ بھی بستر سے لگ گئیں۔ میرے لئے محلے میں باہر نکلنا ناممکن ہو چکا تھا، اس لئے گھر میں ہی جو کچھ کر سکتی تھی کرتی رہی۔ وہ گم صم ابا جی کی چارپائی پر آنکھیں موندے پڑی رہتی تھیں لیکن وقت بہت بڑا مرہم ہے بالآخر انہوں نے بھی خود پر قابو پا ہی لیا۔

گھر میں رشتہ داروں نے آنا چھوڑ رکھا تھا، محلے والے بھی دور دور رہتے تھے۔ اماں جی نے اتنا کچھ بچا رکھا تھا کہ کچھ عرصہ آسانی سے گھر کا خرچ چل سکتا تھا۔ یوں بھی اب خرچ ہی کتنا تھا، ابا جی تھے ہمارے گھر میں خوشیاں تھیں تب خرچ بھی تھا۔ جب سے ابا جی بیمار پڑے تھے میں ان کے لئے نت نئے کھانے پکاتی رہتی تھی۔ انہیں اخبار اور رسالے لا کر دیا کرتی تھی، ڈاکٹروں کے پاس آنا جانا تھا۔ دواؤں کا خرچ تھا، کبھی ماں جی کو کپڑے لا دیتی تھی اور کبھی خود کوئی سوٹ بنا لیتی تھی۔ اب ابا جی نہیں تھے کچھ نہیں تھا، نہ تو پہننے اوڑھنے کو دل چاہتا تھا اور نہ کھانے پینے کو۔ بس زندہ رہنے کی ضرورت تھی سو پوری ہو رہی تھی۔ میں اور ماں جی تو گم صم ہی رہتے تھے، وہ اپنے خیالات میں گم اور میں اپنے میں۔

تب میں باہر ابا جی کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی ماں جی کھانا نکال کر وہیں لے آئیں۔

''سعدیہ کچھ کھا لو صبح سے بھوکی بیٹھی ہو، اس طرح سے فکریں کم تو نہیں ہوں گی۔''

میں نے ان کی بات سنی ضرور تھی لیکن میرا ذہن بالکل خالی تھا، اس لئے سمجھا کچھ نہیں اور چارپائی کا بان اکھیڑتی رہی۔

''یہ کیا ہے سعدیہ؟'' ماں جی کی آواز میں اندیشے، خوف پریشانی اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

میں واپس اپنی دنیا میں پلٹ آئی۔

''کیا ماں جی؟'' میں نے اپنے گرد دیکھا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا میں نے سوالیہ نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز کر دیں، ان کی نظریں میرے سراپے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔

پھر انہوں نے سر پیٹ لیا۔ ''یہ کیا ہو گیا؟ اسی کی کسر رہ گئی تھی کیا؟ کتنی افتادیں ٹوٹیں گی

اس گھر پر مولا؟''

''ہوا کیا؟'' میں اب بھی کچھ نہ سمجھی۔

''تمہیں خود احساس نہیں ہے کہ کیا ہو گیا ہے؟'' ماں جی کی آواز میں غصہ بھی تھا اور جھنجھلاہٹ بھی۔ ''لیکن تم تو بچی ہو، تمہیں کیا پتا چلتا جب مجھے ہی خبر نہ ہوئی۔ میں تو ان افتادوں اور مصیبتوں سے اتنا ٹوٹ چکی ہوں کہ دماغ شل ہو گیا ہے میرا۔ میں نے کیوں نہ سوچا۔'' اب انہوں نے باقاعدہ اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے تھے۔

''ماں جی یہ کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے گھبرا کر انہیں تھاما۔

''یہ کیا ہو گیا میری معصوم بچی کے ساتھ۔'' اب وہ سینے پر دوہتڑ مار مار کر رو رہی تھیں۔ میرے لئے انہیں چپ کرانا محال ہو گیا تھا۔ میں ننگے پاؤں فخرو کی ماں کے پاس دوڑی۔

''چاچی دیکھو ماں جی کو کیا ہو گیا ہے۔'' میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''مجھ سے انہیں سنبھالا نہیں جا رہا۔''

''میں آ جاتی لیکن دیکھو تو سہی کتنا کام بکھرا پڑا ہے، پھر ابھی فخرو کے ابا آتے ہوں گے۔ گھر آ کر اگر میں انہیں نہ ملوں تو زمین آسمان ایک کر ڈالتے ہیں۔''

میں مایوس ہو کر مڑی۔

''ہونہہ ماں جی کو کچھ ہو گیا ہے۔'' میں پلٹ کر دروازے سے نکل رہی تھی تو فخرو کی ماں کی آواز آئی۔ ''عزت والے ماں باپ ہیں نا اس لئے کچھ ہو گیا ہے ایک یہ ہے نہ شرم و حیا، ڈوب نہ مری چلو بھر پانی میں۔''

میں چپ چاپ ماں جی کے پاس چلی آئی۔ کافی دیر بعد جب ان کا رونا دھونا کچھ کم ہوا تو میں بولی۔

''ماں جی اب کیا افتاد پڑی ہے؟''

''تیری کوکھ میں اس گناہ، اس عذاب کا پھل پک رہا ہے اور تجھے خبر بھی نہ ہوئی۔''

میں سناٹے میں رہ گئی، طبیعت تو میری کافی عرصہ سے خراب تھی، لیکن میں اس کی کچھ اور وجہ سمجھتی رہی تھی۔ ماں جی سے اس کے متعلق کچھ کہنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا اس لئے چپ تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ اصل وجہ کیا تھی، اس طرف تو میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔

''میرا برقع لا اندر سے۔''

''اب کہاں جائیں گی ماں جی؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''کسی دائی کو ڈھونڈوں مروں گی اور کیا کروں گی۔''

ماں جی چلی گئیں اور میں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ مجھے تنہائی سے بہت خوف آتا تھا۔ جب میں اکیلی ہوتی تھی تو ہر بے جان چیز بولنے لگتی تھی میرا مذاق اڑانے لگتی تھی۔ مجھے منہ چڑاتی تھی اور اب تو میری تنہائی اور بڑھ گئی تھی۔ گناہ و عذاب کا بیج میرے اپنے وجود میں پروان چڑھ رہا تھا، میری اپنی کوکھ مجھے منہ چڑا رہی تھی۔ اس دن کی ٹھوکر، اس دن کے قہقہے، چیخیں اور سسکیاں یاد دلا رہی تھیں، مجھ پر ہنس رہی تھیں۔

''کب تک فرار کی راہ ڈھونڈو گی۔'' میرے اندر سے کوئی آواز آئی۔ ''نہ وہ رات سے زیادہ تاریک دن تم کبھی بھلا سکتی ہو اور نہ ہی عفریت سے زیادہ بھیانک یادوں سے پیچھا چھڑا سکتی ہو۔ یہ تو مجسم صورت میں تمہارے سامنے آنے والی ہیں، تمہیں ہر لمحہ زندہ درگور کرنے کے لئے، تمہاری آنے والی ساری زندگی میں یہ عذاب زہر بن کر قطرہ قطرہ گرتا رہے گا۔''

''نہیں!'' میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔

مجھے اس وجود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ جو میری ساری زندگی کے لئے پیراسائٹ بننے والا تھا۔ میری زندگی سے جونک بن کر چمٹ رہا تھا، اسے دیمک کی طرح چاٹنے کے لئے اس دنیا میں آنے والا تھا۔

ہر طرف خاموشی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ اتنا سناٹا تھا کہ مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ باہر جتنا سکون تھا میرے اندر اتنے ہی طوفان برپا تھے۔ جیسے پورے چاند کی پُرسکون تنہا راتوں میں سمندر میں جوار بھاٹا اٹھتا ہے، بڑھتی ہوئی لہریں تڑپتی ہوئی لہریں، ساحل سے سر پٹکتی ہوئی لہریں۔

''مدت سے خاموش کھڑا تھا دکھ کا پربت
آن کی آن میں جاگ اٹھی ہے سوئی جوالا
چیخ چیخ کر ٹوٹ ٹوٹ کر گئی چٹانیں۔
لڑھک لڑھک کر اُچھل اُچھل کر لاکھوں پتھر

جیون کی یخ بستہ جھیل میں آن گرے ہیں
لہریں، اتنی لہریں، اتنی بے کل لہریں
پہلے کب دیکھی تھیں دل نے
اس دل اس دیوانے دل نے''

بیرونی دروازے پر دستک ہوئی، خوف نے ایک مرتبہ پھر میرے اندر کنڈلی مار لی۔

''پتا نہیں کون ہو گا؟'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی، پہلے سے زیادہ زور سے، میں اندر ہی اندر سمٹ گئی۔

''سعدیہ'' اب کے دستک کے ساتھ ماں جی کی گھبرائی ہوئی آواز بھی سنائی دی۔

''سعدیہ بیٹی دروازہ کھولو۔''

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور بکھرے بال ہاتھ سے ٹھیک کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔ میرے پہنچتے پہنچتے ماں جی نے بری طرح دروازہ پیٹنا اور مجھے پکارنا شروع کر دیا۔ کنڈی کھلتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

''میری بچی ٹھیک ہے ناں؟'' انہوں نے میری پیشانی چومی۔ ''دروازہ اتنی دیر سے کیوں کھولا؟ خوف کے مارے میرا تو سانس ہی رک گیا تھا، میں نے یونہی بکواس کر دی تھی تم اسے دل سے نہ لگانا۔'' ان کی آنکھوں میں نمی تھی جو انہوں نے اپنے برقعے سے پونچھی۔ پھر وہ پیچھے مڑیں۔ ''تم وہاں کیوں کھڑی ہو شریفاں بی بی اندر آ جاؤ۔''

''چلو سعدیہ تم اپنے کمرے میں اور شریفاں بی بی کو پوری کیفیت بتاؤ۔''

میں چپ چاپ اندر چلی آئی۔

''کچھ امید ہے؟'' چیک اپ کے بعد ماں جی نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم لوگوں کو پہلے کیوں پتا نہیں چلا، ایسے کام میں کبھی اتنی دیر کی جاتی ہے؟''

ماں جی کی آنکھوں میں امید کے جلتے ہوئے دیئے بجھ گئے۔

''پہلے تو اس کی حالت ہی اتنی بری تھی کہ ہمیں خود اس کے بچنے کی امید نہیں تھی، پھر بھی

میں نے مہراں کو بلایا تھا اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ذرا بہتر ہوئی تو اس کا باپ ہمیں چھوڑ گیا۔ ہمیں تو صدموں نے ہی ادھ موا کر دیا تھا، کچھ ہوش آیا اور میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو کافی وقت گزر گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسی بات ہوتی تو سعدیہ خود ہی بتا دیتی، مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ ابھی اسے ان سب باتوں کا پتا ہی کب ہے۔''

''مہراں کو کیا پتا اس کو کچھ آتا جاتا ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں لوگ اس کے پاس کیوں چلے جاتے ہیں۔ بہرحال تم چاہو تو میں دوا دے دیتی ہوں لیکن اس وقت وہ تمہاری بیٹی کے لئے بھی خطرناک ہوسکتی ہے۔''

''نہیں نہیں میں اپنی بیٹی کھونا نہیں چاہتی۔ شریفاں تمہارے ہاتھ میں تو بہت کچھ ہے میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کچھ ایسا کرو کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات مل جائے، لیکن میری بچی محفوظ رہے۔''

''اب ایسا نہیں ہوسکتا، کچھ دوا دی تو دونوں کی زندگی داؤ پر لگے گی۔ باقی سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ کسے شفا دے اور کسے اپنے پاس بلا لے۔''

ماں جی وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''میں اب چلتی ہوں۔'' شریفاں دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ تو چلی گئی لیکن میرے لئے سوچوں اور اذیتوں کے نئے دروازے کھول گئی، میرے رات دن کانٹوں کے بستر پر گزر رہے تھے۔ ماں جی میرا بہت خیال رکھنے لگی تھیں لیکن ہم دونوں کے درمیان صبح سے رات تک کبھی ایک بات ہوتی تھی اور کبھی دو باتیں۔ اب مجھے معلوم ہوا تھا کہ کبھی الفاظ اپنے تمام معنی سارے رنگ کھو دیتے ہیں۔ پھر خاموشی کی زبان میں رنگ بھر جاتے ہیں، سناٹا خود ہی سارے مفہوم سمجھا دیتا ہے۔

''لیکن انیس شاہ تم نے تو کہا تھا کہ میری عمر میں سبھی کو لفظوں سے، رنگوں سے محبت ہونی چاہیے۔ پھر تم نے میرے گرد سناٹے کیوں بکھیر دیئے، تم تو جانتے تھے کہ مجھے سناٹے سے وحشت ہوتی تھی۔''

اس دن پہلی مرتبہ میں نے انیس شاہ کے متعلق سوچا تھا، اس سے قبل میری نظروں کے سامنے وہ نہیں شیطانیت اور ہوس میں ڈوبا ہوا عفریت ہی آیا کرتا تھا۔

''اگر وہ عفریت دوبارہ انیس شاہ میں بدل گیا تو شاید بھنور میں پھنسی ہوئی میری ناؤ باہر نکل سکے۔''

یہی سوچ کر میں اس کے گلبرگ والے خوبصورت بنگلے پر پہنچ گئی، اس کا بڑا سا آہنی پھاٹک بند تھا لیکن اسے باہر کھڑے کھڑے کھولنا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ بڑے بڑے رقبوں پر پھیلے ان مکانوں کے اوپر شام اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے دور تک روشنی چلی گئی تھی، سامنے گیراج میں نئے ماڈل کی تین لشکتی ہوئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ روش کے بائیں جانب شاید لان تھا جس کے درختوں کی شاخیں باہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہیں سے ہنسنے بولنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً سب گھر والے وہیں اکٹھے تھے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ ہاں بائیں کونے میں لاگشونیا کے پھولوں سے جھانکتی ہوئی ایک کال بیل تھی جس سے گھر میں اپنے آنے کی اطلاع دی جاسکتی تھی۔ تھوڑی دیر تک میں شش و پنج میں پڑی رہی۔

''کیا کروں؟ بیل بجاؤں یا یونہی اندر چلی جاؤں۔ نہ جانے ان بڑے گھروں کا کیا دستور ہو، میں بیل بجاؤں اور کوئی ملازم مجھے اندر ہی نہ گھسنے دے۔ نہیں مجھے انیس شاہ تک ضرور پہنچنا ہے۔'' یہ سوچ کر میں نے قدم آگے بڑھا دیئے اور چٹخنی کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

میرا اندازہ درست تھا، روش کے بائیں جانب مہکتے پھول پودوں والے وسیع لان میں کافی لوگ جمع تھے۔ لان چیئرز کے درمیان چائے کی ٹرالی رکھی ہوئی تھی۔ انیس شاہ گھاس پر بیٹھا ایک ننھے منے سے بچے سے کھیل رہا تھا۔

''ادھر دیکھو اونہوں یہاں اپنے بابا کی طرف۔'' پھر وہ لان میں موجود دیگر لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ''یہ جو ہمارا بیٹا ہے ناں عباس یہ بہت بے وفا ہے، اس کے اتنے ناز نخرے اٹھاتا ہوں میں پھر بھی یہ مجھے لفٹ ہی نہیں کراتا۔''

میں متذبذب انداز میں روش پر کھڑی ہوئی تھی، جب کسی عورت کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سبھی نے میری جانب دیکھا۔ سوائے انیس کے سبھی کی آنکھوں میں میرے لئے اجنبیت تھی، مجھے دیکھ کر اس نے اپنے بیٹے عباس کو نیچے گھاس پر بچھے نرم گدیلے پر لٹا دیا اور میری جانب چلا آیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے دھیمی آواز لیکن سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم کیا بات ہے؟" میں اس وقت کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی ورنہ بازی میرے ہاتھ سے نکل بھی سکتی تھی۔

"میں کل تم سے بات کروں گا اس وقت یہاں سے جاؤ۔"

"جو بات ہوگی وہ یہاں ہوگی سب کے سامنے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

چند لمحے وہ قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ "میں تمہیں کسی قسم کی بلیک میلنگ کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"جب کوئی کسی قسم کا ارادہ کر لے تو اسے اجازت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیسے تم نے مذہب اور معاشرے سے سرٹیفکیٹ نہیں لیا تھا اور میں تو جھوٹ بھی نہیں بول رہی ہوں کہ تم اسے بلیک میلنگ کا نام دو۔"

"کون ہے انیس؟" پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"کوئی نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"مجھے پیسوں کی نہیں تمہاری اولاد کے لئے تمہارے نام کی ضرورت ہے۔" میں نے اپنے غصے پر بہت مشکل سے قابو پا کر تحمل کے ساتھ کہا۔

"بکواس مت کرو رقم بتاؤ۔" اس کی آواز اب بھی دھیمی اور لہجہ سخت تھا۔

"تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں طوائف نہیں ہوں اور نہ یہ کرائے پر حاصل کی گئی کوئی بے جان چیز ہوں۔ میں تمہاری ہوس اور شیطانیت کا شکار ہوئی ہوں۔ تمہارے روپے پیسے پر میں لعنت بھیجتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے سوائے ایک نام کے وہ بھی اپنے لئے نہیں تمہاری اولاد کے لئے۔" اب غصے پر قابو پانا میرے لئے ناممکن ہو گیا تھا اور میری آواز لحہ بہ لحہ بلند ہو رہی تھی۔

لان میں باتوں کی جو مدہم مدہم بھنبھناہٹ تھی وہ یکدم ختم ہو گئی۔

"شٹ اَپ!" وہ دھاڑا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہاری اس بکواس کو یہ سب مان لیں گے۔" اس نے لان کی طرف اشارہ کیا۔ "بتاؤ کس نے بھجوایا ہے تمہیں؟ چند ٹکوں کے عوض تم نے نہ صرف اپنا ایمان بیچ دیا بلکہ میری عزت بھی داؤ پر لگانا چاہتی ہو۔ بتاؤ تمہیں کتنے

پیسے ملے ہیں اس کام کے؟ میں تمہیں اس سے دوگنے پیسے دوں گا۔" اب اس کی آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔

میں حیران دم بخود کھڑی تھی، وہ یہ کیا کہہ رہا تھا کیسا پینترا بدلا تھا اس نے۔

"مجھے کسی نے نہیں بھجوایا، میں بہت مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں۔"

"تم جیسی ٹکے ٹکے کی لڑکیاں جب محلوں کے خواب دیکھتی ہیں تو کسی اور کا گناہ کسی عزت دار امیر شخص کے سر تھوپ کر اسے ایسے ہی مجبور کرتی ہیں۔"

ایک عورت تیزی سے ہماری جانب بڑھی۔

"کون ہو تم؟ کیوں آئی ہو یہاں؟" وہ بہت غضبناک ہو رہی تھی۔

"میں اس کی اولاد کے لئے نام لینے آئی ہوں، نہ مجھے کسی نے بھجوایا ہے اور نہ ہی مجھے تم لوگوں کی دولت کی ضرورت ہے۔" میری آواز ابھری۔

"بکواس بند کرو۔" پھر وہ انیس کی جانب مڑی۔ "یہ غلط کہہ رہی ہے ناں؟"

"یہ نہ صرف غلط کہہ رہی ہے بلکہ بہتان تراشی کر رہی ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"جھوٹ مت بولو میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ جو تم کہہ رہے ہو وہ محض خود کو بچانے کی تمہاری تدبیر ہے۔"

آنسوؤں کا پھندا سا میرے گلے میں لگ گیا اور آنکھوں کے سامنے سب کی صورتیں نمی کی وجہ سے دھندلا گئیں۔

"لڑکی بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔" شاید سب ہی ہمارے گرد آ گئے تھے۔ تب ہی ایک مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "یہاں کوئی بھی تمہاری اس بلیک میلنگ سے متاثر نہیں ہوگا۔"

"میں نہیں جاؤں گی یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔"

"آل رائٹ مان لیا کہ یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔" ایک اور عورت طنزاً بولی۔ "تو پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر انیس نے یہ شغل کر لیا ہے، تم بتاؤ کتنی رقم لے کر اپنا منہ بند کرو گی۔"

"رقم، پیسہ دولت یہ سب میری کھوئی ہوئی عزت واپس لا سکتے ہیں۔" میں چلائی۔ "جو کچھ تمہارے نزدیک شغل ہے اس نے میری ساری زندگی برباد کر دی ہے۔"

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔" ایک بزرگ خاتون چیخ کر بولیں۔

"پوچھ لیں اپنے بیٹے سے کہ یہ کیسا ہے؟ پہلے اس نے ٹائپنگ کے بہانے مجھے آفس میں روکا، پھر شادی کی پیشکش کی اور میرے انکار پر یہ ہوس کی انتہاء پر پہنچ گیا۔"

"تم سے شادی؟" پہلی والی عورت بھڑک گئی۔ "میرے ہوتے ہوئے انیس تم سے شادی کرے گا؟ میں نے اپنے شوہر کو کوئی کمی نہیں ہونے دی کہ اسے باہر عورتوں کو تاکنے کی ضرورت پڑے اور تم ہو کیا چیز؟ اپنی شکل بھی کبھی دیکھی ہے شیشے میں؟ اور یہ جو کپڑے ہیں تمہارے جسم پر ایسے کپڑے تو ہماری نوکرانیاں بھی پہننا پسند نہیں کرتیں۔ تم میں ہے کیا کہ انیس تم سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتا؟"

"مجھے نہیں پتا کہ مجھ میں کچھ ہے یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ مجھ میں تمہارے شوہر کو کیا نظر آیا، یہ اسی سے پوچھ لو۔ رہ گئی تمہاری دولت تو میں تھوکتی ہوں اس پر۔"

"زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" انیس دہاڑا۔ "بہتر ہوگا کہ تم اپنے پاؤں پر یہاں سے چلی جاؤ ورنہ مجھے تمہیں باہر پھنکوانا پڑے گا۔"

آنسو مسلسل میرے گالوں پر بہہ رہے تھے، میں نے وہاں کھڑے ہر ایک شخص کی جانب ملتجی نظروں سے دیکھا لیکن سب کی چہروں پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔

"اب یہاں کیوں کھڑی ہو، دفع ہو جاؤ۔" اس کی بیوی نے مجھے دھکا دیا۔

"میں جا رہی ہوں لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ مظلوم کی آہ سے عرش بھی کانپ اٹھتا ہے۔ تم نے میری اولاد کو وہ شفقت دینے سے انکار کیا ہے جس پر اس کا حق ہے۔ میری بددعا ہے کہ تم اپنے اس بیٹے کو بھی یہ شفقت دینے کے لئے ترسو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اولاد کی دولت سے محروم ہو جاؤ۔"

"اسے نکالو انیس!" اس کی بیوی چیخی۔ "میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔"

"دفع ہو جاؤ ورنہ میں نوکروں کو بلوا کر تمہیں باہر پھنکواتی ہوں۔" اس دوسری عورت نے مجھے دھکا دیا۔

میں نے ایک نظر ان لوگوں کو دیکھا اور پھر گیٹ سے نکل گئی۔

☆======☆======☆

وہ دسمبر کی بہت طوفانی بہت سرد رات تھی۔ بارش اس زور سے برس رہی تھی گویا اس دن کے بعد کبھی نہیں برسے گی۔ میرے جسم سے زیادہ میری روح تڑپ رہی تھی۔

میرے پہلو کے قریب رکھے سفید کمبل میں ایک جیتا جاگتا سرخ و سفید وجود تھا جس کے رونے کی آواز مسلسل میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ ماں جی اسے نظر انداز کئے میری طرف متوجہ تھیں۔

"سعدیہ آرام کرو، سعدیہ فلاں چیز کھا لو، میں سر دبا دوں اپنی بیٹی کا۔ سونے کی کوشش کرو میری چندا۔" اور نہ جانے کیا کیا۔

میں نے آنکھیں موند لیں لیکن رونے کی آواز اس ننھے سے وجود سے نکل نکل کر کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔

"ایک تو اس کی ٹیپ بند نہیں ہو رہی ٹیں ٹیں ہی کئے جائے گا۔" ماں جی بڑبڑائیں۔

"گندگی کا ڈھیر، سانپ کا بچہ۔" میرا دل کسی نے جیسے مٹھی میں بھینچ لیا۔

"ماں جی اسے مجھے دے دیں چپ ہو جائے گا۔" میں اٹھ بیٹھی۔

"تم سو جاؤ یہ چپ ہونے والا نہیں ہے میں اسے دوسرے کمرے میں لے جاتی ہوں۔"

"ماں جی یہ مجھے دے دیں۔" میں نے اصرار کیا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا مجھے کہ اس کا ایک لمحے کا رونا بھی دل کانٹے ڈال رہا تھا۔

"اس کے تمہارے وجود سے الگ ہوتے ہی تمہاری زندگی کا وہ حصہ ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے۔ گناہ کا کوئی دھبہ

اب تمہارے دامن پر نہیں رہے گا، میں صرف اس انتظار میں تھی کہ گناہ کی یہ آخری علامت بھی تم سے الگ ہو جائے۔"

میں تڑپ اٹھی۔ "ماں جی یہ گناہ کی علامت نہیں ہے، یہ میرا بیٹا ہے اس کا کوئی قصور نہیں ہے یہ تو جانتا بھی نہیں ہے کچھ اور پھر یہ اپنی مرضی سے تو نہیں آیا دنیا میں۔"

"جس نظر سے تم اسے دیکھ رہی ہو اس نظر سے یہ دنیا والے اسے نہیں دیکھیں گے۔ وہ تم سے اس کے باپ کا نام پوچھیں گے تو کیا جواب دو گی؟ اور جب بڑا ہو کر یہ تم سے اپنے باپ کے متعلق پوچھے گا تو کیسے تسلی کرو گی اس کی؟ کیا بتاؤ گی اسے کہ یہ کس تعلق کی پیداوار ہے؟ اس کے سامنے یہ تسلیم کرلو گی کہ اس کے باپ اور تمہارے درمیان قائم ہونے والا تعلق انسانیت کی سب سے بڑی تذلیل کی علامت ہے اور یہ تذلیل مجسم ہو کر تمہارے سامنے آ گئی ہے۔"

"نہیں" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتی، میرے بیٹے کوئی قصور نہیں ہے میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم جذبات سے کام لے رہی ہو لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، میں جانتے بوجھے تمہیں اس کانٹوں بھرے راستے پر نہیں چلنے دوں گی اور نہ ہی تمہاری ساری زندگی تمہار جذباتیت کے پیچھے تباہ ہونے دوں گی۔ ابھی تو تم پورے سولہ برس کی بھی نہیں ہو۔ ا سنپولئے کی موجودگی میں کوئی تمہارا ہاتھ نہیں تھامے گا، کسی اور کی کمینگی کی سزا تم کیوں بھگ تمہیں خبر بھی نہیں کہ میں نے ساری رات رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی ہیں کہ وہ تمہ اس مصیبت، اس عذاب سے نکالے۔ میں ایک بار پھر تمہیں اس بھنور میں پھنسنے نہ دوں گی۔"

انہوں نے ایک جھٹکے سے اس ننھے سے وجود کو اٹھا لیا اور باہر کی طرف بڑھیں۔

"ماں جی اسے کہاں لے جا رہی ہیں۔" میں چلائی لیکن وہ رکیں نہیں۔ میں اپنا آ بھول کر ان کے پیچھے لپکی۔

"ماں جی خدا کے لئے ایسا غضب نہ کریں یہ اس سردی میں مر جائے گا۔"

ماں جی نے مڑ کر نہیں دیکھا اور مسلسل آگے بڑھتی رہیں۔ بارش تھم چکی تھی، صبح صا

وقت تھا لیکن ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی فضا بے حد خنک تھی۔

"ماں جی مجھے اپنے بیٹے کو تو دیکھ لینے دیں، اسے چھو تو لینے دیں۔" میں بلک اٹھی لیکن میری آواز تیز چلتی ہوئی ہوا نہ جانے کہاں لے اڑی اور ماں جی کے قدم نہ رکے۔

میں ان کے پیچھے دوڑنا چاہتی تھی لیکن نقاہت کے مارے چکر آیا اور میں وہیں برآمدے میں ڈھیر ہو گئی۔ میرے ارمان میری مرادیں سب کچھ ماں جی اپنے ساتھ لے گئی تھیں، اس پورے عرصے میں میں نے اپنے اندر پروان چڑھتے ہوئے وجود سے نفرت کی تھی۔ لیکن اس کی پہلی آواز کے ساعت سے ٹکراتے ہی نفرت کی وہ برف محبت کی تیز دھوپ سے پگھل کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ کیسے شدید نفرت ایک ہی لمحے میں شدید ترین محبت میں بدل گئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے اپنے بیٹے کی پیدائش کے ساتھ ہی میں بھی ایک مرتبہ پھر پیدا ہوئی ہوں۔ ایک بالکل مختلف انداز میں، شاید اسی کا نام مامتا تھا۔ جو میرے وجود کے کہیں اندر سے پھوٹ رہی تھی اور میں پور پور اس میں بھیگتی جا رہی تھی۔

لیکن میرا اور میری محبت کا ساتھ کتنا مختصر تھا۔ میرے پاس تو اس کی یاد بھی نہیں تھی، وہ کیسا تھا؟ اس کی آنکھیں کیسی تھیں؟ اس کی پیشانی کس طرح چمکتی تھی؟ اس کے گالوں کا رنگ کیسا تھا؟ کیا اس کے ہونٹ بھی تازہ گلابوں کی پتیوں جیسے تھے؟ کیا اس نے بھی اپنی بند مٹھیوں میں ہر ننھے بچے کی طرح فرشتے بند کر رکھے تھے؟

کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا مجھے، نہ ہی میں نے اس کے لمس کا ذائقہ چکھا تھا۔ میں نے اسے تھاما بھی نہیں تھا، اس کے ننھے ہاتھوں کا لمس اپنے چہرے پر بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے میرے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا تھا، میں تو اتنی بدنصیب تھی کہ اس کی پیشانی بھی نہیں چوم سکی تھی۔

اگر میرے پاس اس کا کچھ تھا تو محض وہ آواز جو میرے وجود میں رچ بس گئی تھی اس کی میٹھی سریلی آواز۔ نہیں وہ تو مجھے مدد کے لئے پکار رہا تھا مجھے، اپنی ماں کو آواز دے رہا تھا کہ اسے وحشتوں کے اس جنگل میں بھٹکنے سے بچا لوں۔ اس سے اس کا سائبان نہ چھینوں اسے مرنے کے لئے اس تاریک، سرد اور سفاک رات کے حوالے نہ کروں۔

میں ایک بار پھر اٹھی، پوری ہمت مجتمع کر کے کبھی چلتی کبھی گھسٹتی بیرونی دروازے تک

پہنچی۔ جس کے دونوں پٹ وا تھے، گلی سنسان تھی، موڑ پر ایک بلی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ دور کہیں ایک لمحے کے لئے بجلی کوندی تھی اور پھر گڑگڑاہٹ کی آواز سے درودیوار کانپ اٹھے تھے۔ خدا معلوم یہ بجلی کہاں گری تھی؟ لیکن میں نے امیدوں اور مرادوں کے جتنے تنکے جمع کئے تھے وہ سب راکھ ہو گئے۔ اس راکھ کو کرید کر میں نے اپنے بیٹے کا نام مراد رکھ دیا۔

☆======☆======☆

پھر ہم اس شہر میں نہیں ٹھہرے، وہاں سے بہت دور کراچی آ گئے۔ ماں جی نے جمع شدہ پیسوں سے سلائی مشین خرید لی اور میں نے سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرتے ہوئے کتابوں کا سہارا لیا۔ اب میں گھر سے باہر نکلنا نہیں چاہتی تھی، مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ جب کسی بچے پر نگاہ پڑتی تھی، مراد کی معصوم آواز میرے پورے وجود کو گھیرے میں لے لیتی تھی۔ جب کسی لڑکی کو ہنستے ہوئے دیکھتی تو میرے چاروں طرف دُکھ اور حیرانگی کی دبیز چادر تن جاتی تھی۔ کیا اس دنیا میں اتنی کشش اور اتنی خوبصورتی تھی کہ کوئی لڑکی ہنس سکے؟ اور جب کسی مرد پر نگاہ پڑتی تھی تو خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرائیت کر جاتی تھی۔ کیا خبر کون کب اور کہاں اپنا چولا بدل لے؟

میں نے کسی کالج میں داخلہ نہیں لیا، گھر میں ہی پڑھتی رہی۔ اس لئے سائنس کی بجائے آرٹس پڑھنا پڑی لیکن بی اے پاس کرنے کے بعد جب ایم اے میں داخلے شروع ہوئے ماں جی میرے پاس آ گئیں۔ ہم دونوں کے درمیان بہت کم بات چیت ہوتی تھی لیکن ماں جی ہر طرح سے میرا خیال رکھتی تھیں۔ کھانے میں وہی بنتا تھا جو مجھے پسند تھا، نئے فیشن کے کپڑے اپنے ہاتھ سے سی کر دیتی تھیں۔ مجھے ان میں سے کسی چیز کا شوق نہیں رہا تھا، میں صرف اس لئے زندہ تھی کہ ماں جی زندہ تھیں اور مجھے زندہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ ورنہ میرے لئے کسی چیز میں کوئی کشش نہیں تھی۔

اس دن ماں جی کے آنے سے پہلے میں ظہور نظر کی نظم پڑھ رہی تھی۔

''کہاں چلی ہو میری اُمنگو؟

میری اُمنگو کہاں چلی ہو؟

اگر خوشی کوئی بھی نہیں ہے تو فرطِ غم ہی سے مسکراؤ

مگر مجھے کربناک تنہائیوں میں یوں چھوڑ کر نہ جاؤ

ابھی تو صرف ایک خراش آئی ہے

وہ بھی احساس کی زباں پر

ابھی تو آئیں گے سینکڑوں زخم

روح پر، دل پہ، جسم و جاں پر

ابھی تو آغاز ہی ہوا ہے

ابھی تو در باز ہی ہوا ہے

کہاں چلی ہو میری اُمنگو؟

میری اُمنگو کہاں چلی ہو؟''

میں نے پڑھتے پڑھتے آنکھیں بند کر لیں۔

''سعدیہ!'' ماں جی میرے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''تمہارے ابا جی کی بہت خواہش تھی تمہیں تعلیم دلوانے کی۔ اب جب تم بی اے کر چکی ہو تو ایم اے میں داخلہ لے لو، اگر پڑھنے کا ارادہ نہ ہو تو کچھ اچھے رشتے بھی ہیں، میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔''

میں نے شاکی نظروں سے ماں جی کی طرف دیکھا۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن نفسیات سے خوب واقف تھیں۔ انہوں نے جو دو تجویزیں میرے سامنے رکھی تھیں میں ان دونوں پر ہی عمل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جھوٹ اور ریاکاری سے مجھے نفرت تھی اور اپنی زندگی کے اس کڑوے سچ کے ساتھ میں کسی کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتی تھی، داخل ہونا چاہتی بھی نہیں تھی۔

دوسری جانب میرے وہم اور خوف تھے۔ بھیڑیوں کی بستی سے مجھے ڈر لگتا تھا اور انسانوں کے جنگل میں ایک قدم چلنا بھی میرے لئے دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

اور تیسری طرف ماں جی تھیں جو صرف اپنی ممتا کی وجہ سے جی رہی تھیں۔ محض اس

لئے کہ وہ مجھے جیتا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں اور میری خاطر خود سمیت ساری دنیا کو بھی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا سکتی تھیں۔

"میں آپ کو کل بتاؤں گی۔" بالآخر میں نے کہا۔

"اچھا۔" وہ اٹھ گئیں۔

یہ طے تھا کہ میرے داخلہ نہ لینے کی صورت میں وہ میری شادی ضرور کریں گی کیونکہ انہیں اپنی زندگی کا بھروسا نہیں تھا۔ غموں نے انہیں اندر ہی اندر چاٹ لیا تھا اور وہ اباجی کے پاس جانے سے پہلے مجھے محفوظ دیکھنا چاہتی تھیں۔ انہیں میرے لئے کوئی سہارا درکار تھا، ایسا سہارا جو ساری زندگی میرا بوجھ اٹھا سکے۔ اس کی دو ہی صورتیں تھیں کہ میں شادی کرلوں یا تعلیم حاصل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں۔

چونکہ میں منافقت نہیں کرسکتی تھی اس لئے مجھے یقین تھا کہ میں شادی کے اگلے ہی دن اس دہلیز پر واپس پہنچ جاؤں گی۔ ماں جی شاید یہ صدمہ نہ سہار سکتیں اسی امید کے سہارے تو وہ زندہ تھیں۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو گھر سے باہر نکلنے پر آمادہ کیا اور اگلے دن ماں جی کو بتا دیا کہ میں ایم اے میں داخلہ لے لوں گی۔

یونیورسٹی پہنچ کر میری زندگی میں بہت مثبت تبدیلی آئی، دنیا کے جو رنگ پھیکے پڑ گئے تھے اب ان میں اس قدر کشش ضرور ابھر آئی تھی کہ وہ دیکھنے کے قابل لگتے تھے لیکن پھر بھی میں انہیں صرف دیکھتی تھی ان میں بھٹکتی نہیں تھی۔ ہر ایک سے بات کرتی تھی لیکن کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ مجھے کوئی انسان قابل اعتبار نہیں لگتا تھا، تب کچھ لوگوں نے بہت خلوص کے ساتھ میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی۔

وہ گہری نیلی آنکھوں والا آفاق جو مجھ سے بات کرنے کے بہانے تلاش کیا کرتا تھا اور جب میں ہمیشہ کی طرح پیڑ کے نیچے بیٹھ کر نوٹس تیار کرتی تھی تو وہ ٹیرس پر کھڑے ہو کر کتنی دیر تک مجھے تکا کرتا تھا۔ پھر وہ سلمان تھا جس کی شوخی اور حاضر جوابی کی وجہ سے پورے ڈیپارٹمنٹ میں قہقہے گونجا کرتے تھے۔ وہ جس جگہ جس گوشے میں چلا جاتا وہاں ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے تھے۔ وہی سلمان فائنل امتحانوں کے قریب میرے پاس آیا تھا۔

"سعدیہ امتحانوں کے بعد میں اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "اگر وہ صرف ملنے آنا چاہتی ہیں تو آ جائیں لیکن اگر وہ کسی اور وجہ سے آنا چاہتی ہیں تو وہ محض اپنا وقت ضائع کریں گی۔"

"کیوں؟"

"یہ بہت ذاتی سوال ہے۔"

تب وہ کتنا چپ ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ جنید بھی تو تھا جو سارے ڈیپارٹمنٹ میں "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتا پھرتا تھا اور پورے ملک اور سارے معاشرے میں انقلاب برپا کرنا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اس نے ملک کے بیشتر مسائل چائے کی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے حل کئے تھے لیکن اس بات کا بہت افسوس تھا کہ وہ کسی ایسے منصب پر فائز نہیں ہے جہاں رہتے ہوئے وہ اپنی تھیوریز کو Implement کر سکے۔ بس یہی وہ واحد مسئلہ تھا جو وہ ابھی تک حل نہیں کر سکا تھا کہ وہ اپنے انقلابی اقدامات کو معاشرے میں کیسے پھیلائے۔ میں ہمیشہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو ابھی تک حل طلب ہے اور یہ مسئلہ عورت کو باقی سب بے جان چیزوں کی طرح ملکیت سمجھنے کا ہے۔ جسے سب بے جان اور بے روح چیزوں کی طرح کوئی بھی کسی طرح بھی حاصل کر سکتا ہے اور استعمال کے بعد ڈسٹ بن میں پھینک سکتا ہے۔

لیکن میں نے اس سے یہ بات نہیں کہی، میں یوں بھی اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی کیونکہ شروع کے دنوں میں میں نے اس کا اپنے بارے میں تبصرہ سن لیا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی لیکن اس لڑکی میں کوئی خاص بات ہے۔ کوئی اسرار، کوئی Strange سی بات ہے اس میں، بہت Wild Beauty ہے اس کی۔"

اور تب ہی میں نے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے بڑھا دیئے تھے۔ اس نے مجھے موم کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن میرے رویے میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اچھا لڑکا ہے لیکن میں اب کسی پر بھی اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ میں قدم آگے بڑھاتی گئی، وقت پیچھے رہتا گیا۔ گیلی ریت پر قدموں کے نشان بنتے رہے، میرا اعتماد لوٹ آیا۔ بہت سی راہیں کھلیں، ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے جب

امریکہ جانے کا اس کالرشپ ملا تو اتنے عرصے کے بعد سچی سچ مچ کی خوشی نے میرے اندر انگڑائی لی۔ کیا ہوا جو میں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری نہیں لی، ڈاکٹر صرف ایم بی بی ایس کرنے والے تو نہیں بنا کرتے۔ ابا جی کی یہی تو خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور میں نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں ان کی یہ خواہش پوری کروں گی۔ یہ چانس میں کسی صورت مس نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب گھر پہنچ کر ماں جی کو دیکھا تو چپکی رہ گئی۔ انہیں اکیلا چھوڑ کر میں کیسے جاسکتی تھی۔

نہ جانے میری اور ماں جی کی فریکوئنسی کہاں ملی ہوئی تھی کہ وہ کہے سنے بغیر میرے راستے کے پتھر ہٹاتی جاتی تھیں اور راہوں میں بکھرے کانٹے اپنے دامن میں ڈال کر میرے قدموں کے لئے راستے صاف کرتی جاتی تھیں۔ یہ بات بھی پتا نہیں کس طرح انہوں نے سمجھ لی کہ اب میرے آگے بڑھنے کے راستے میں خود ان کا وجود حائل ہے، سو انہوں نے رات کو ایسے آنکھیں موندیں کہ پھر کبھی نہیں کھولیں۔ انہوں نے خود کو میرے راستے سے ہٹا کر مجھے آگے بڑھنے کے لئے گزرگاہ دے دی۔ اب میرے لئے یہاں کیا رکھا تھا، میں نے اس زمین اس مٹی کو الوداع کہہ دیا۔

☆======☆======☆

اپنے ماضی سے فرار حاصل کرنے کے لئے میں نے دربدری کا بہت طویل زمانہ گزارا۔ پہلے امریکہ، پھر برطانیہ اس کے بعد فرانس اور اٹلی اور آخر میں سعودی عرب۔ ان دنوں میں واشنگٹن میں تھی اور پاکستان سے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں کی ساری خوبصورتی اور سارے رنگ بھی مجھے اس اداسی سے باہر نہیں لا سکے تھے۔ جو ابا جی کے بعد اب ماں جی کی وفات نے میرے تمام وجود میں بھری دی تھی۔ ایسے ہی ایک دن میں پارک میں بیٹھی ہوئی بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ میری ملاقات ایک ننھی سی بچی سے ہوئی۔ تانیا کی ماں کچھ عرصہ پہلے فوت ہوئی تھیں اور اب وہ بھی میری طرح تنہا تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی تنہائیاں بانٹ لیں، کہنے کو تو وہ مجھے آنٹی کہتی تھی لیکن مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی کہ ماں سے کی جاتی ہے، میں نے بھی اپنی ساری ممتا اس پر نچھاور کردی۔

تانیا کے والد فیضان علی شاہ فارن سروس میں تھے اور حکومت پاکستان کی طرف سے امریکہ میں تعینات تھے۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتے تھے، پھر یہ ساتھ کچھ اتنا طویل تو نہیں تھا لیکن اس کے اثرات بہت گہرے تھے۔ ہم صرف تین سال اکٹھے رہے تھے۔ تانیا کے ڈیڈی اکثر اسے میرے اپارٹمنٹ چھوڑ جاتے تھے اور وہ ہفتہ ہفتہ بھر میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔ اسے مجھ سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود وہ اپنی چھٹیاں میرے ساتھ ہی گزارا کرتی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے ڈیڈی لاہور میں سیٹل ہوگئے اور سعودی عرب سے لاہور آنے کا ارادہ کرتے ہوئے مجھے یہ تسلی دی کہ اب بھی وہاں میرا اپنا کوئی ہے۔

☆======☆======☆

اور اب میں کتنے سالوں بعد وطن لوٹ آئی تھی۔ امریکہ، کینیڈا، فرانس، اٹلی اور سعودی عرب سے ہو کر اب واپس لاہور جس شہر کو اکیس سال قبل میں چھوڑ گئی تھی۔ وہیں اپنی منزل کا سراغ ڈھونڈنے پلٹ آئی تھی، لیکن یہاں آکر سکون اور اطمینان کا ایک ہفتہ بھی بمشکل گزار سکی تھی کہ سمندر کی آہستہ آہستہ خرام موجوں میں بھنور پڑنے لگے تھے۔ آج صبح تانیا کو عباس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر وہ نفرت پھر عود کر آئی تھی، جسے اتنے برس سے میں تھپک کر سلا رہی تھی۔

☆======☆======☆

''وہ صحن سے سے پلٹ گئی تھی
دھنک کی خوشبو
وہاں ابھی تک درخت اپنی برہنگی میں
پکارتے ہیں
پکارتے ہیں
دھنک کی خوشبو
وہ خواب لادے
کہ جن سے بھر جائیں رات بھر میں

سبو ہمارے"

میں نے آنکھیں موند لیں۔ وہ ایسی ہی سرد سفاک رات تھی جب میر امراد مجھ سے بچھڑ تھا، ماں ہوتے ہوئے بھی میں اس کے لمس سے نا آشنا تھی۔ پتا نہیں ماں جی اسے کہاں چھوڑ آئی تھیں۔ شاید اگلے دن اخبار میں چند لائنوں کی خبر بھی چھپی ہو کہ ایک ماں نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے اپنے نوزائیدہ بچے کو کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا اور وہ بچہ سردی کی تاب نہ لاتے ہوئے کچرے کے اسی ڈھیر پر مرا ہوا پایا گیا۔

آج عباس کو دیکھا

"تو تمام چہروں سے ایک آنکھ

تمام آنکھوں سے اک اشارہ

تمام برسوں سے ایک لمحہ برس پڑا"

میں راکنگ چیئر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی آئی، رات تمام ہوگئی تھی۔ آتش دان میں جلتے ہوئے کوئلے سرد ہوگئے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے اور بادلوں کے برسنے کے بعد آسمان کا شفاف نیلا رنگ نمایاں ہوگیا تھا۔

☆======☆======☆

"آنٹی" تانیا نے دروازے سے جھانکا۔"آپ تیار ہوگئیں؟"

"ہوگئی ہوں لیکن تم باہر کیوں کھڑی ہو؟ اندر آجاؤ۔" میں نے اورنج جوس کا ایک گلاس اس کے لئے بھی بھرا۔

"اصل میں آج میری گاڑی خراب ہے، ڈرائیور سے کہا ہے کہ ورکشاپ لے جائے میں نے سوچا آپ کے ساتھ ہی چلی جاؤں۔" وہ اندر آگئی۔

"بس ایک منٹ تم جوس پیو تب تک میں ذرا ڈرائنگ ٹھیک کر دوں۔"

"رہنے دیں آنٹی صغراں کر دے گی۔"

"اونہوں سب کام ملازموں پر نہیں چھوڑے جاتے۔" میں جلدی جلدی چھوٹے ڈرائنگ روم کے فلور کشن ٹھیک کرنے لگی۔ تانیا بھی جوس کا گلاس تھامے میری مدد کرنے لگی۔

"بس آنٹی!" بالآخر اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی

کینال روڈ پر مڑتے ہوئے میرے ذہن میں مچلتا ہوا سوال میرے لبوں پر آگیا۔

"کل جولڑکا تمہارے ساتھ کھڑا ہوا تھا غالباً عباس نام ہے اس کا وہ کون ہے؟"

"ابھی تو کلاس فیلو ہے لیکن ہم لوگ انہیں کئی برسوں سے جانتے ہیں، فیملی فرینڈز ہیں ہمارے۔"

"اس کا باپ کون ہے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں نفرت اتر آئی۔

میری نفرت کا اظہار اس قدر واضح تھا کہ چند لمحوں تک تانیا مجھے الجھی ہوئے نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"وہ بہت بڑے انڈسٹریلسٹ ہیں، بیسیوں کارخانوں کے مالک ظفر علی شاہ۔"

"ظفر علی شاہ؟" اسٹیئرنگ پر میری انگلیوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

بڑے شاہ صاحب انیس شاہ کے بہنوئی ظفر علی شاہ، یہ کیسے ہوسکتا ہے یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔

"جی۔" تانیا نے کہا۔"بہت اچھے لوگ ہیں، ہمارے گھر آنا جانا بھی بہت ہے۔"

"کسی کی اچھائی اس کے ماتھے پر تحریر نہیں ہوتی۔" میں ہولے سے بولی۔"اعتبار کرو لیکن آنکھیں کھلی رکھ کر۔"

"آپ غالباً کچھ اور کہنا چاہتی ہیں لیکن میں آپ کی بات سمجھی نہیں ہوں۔" اس کی اپنی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

"میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ میں تمہیں زندگی کے کسی مقام پر ٹھوکر لگتے اور گرتے نہیں دیکھ سکتی، کیونکہ بعض ٹھوکریں ایسی ہوتی ہیں جن کے بعد انسان کبھی اٹھ نہیں سکتا۔" میں نے کار فیصل آڈیٹوریم کے ساتھ پارک کر دی۔ پھر شگفتہ لہجے میں بولی۔"یاد ہے آج میں نے تمہاری پہلی کلاس لینی ہے۔"

"یہ بھی بھولنے کی بات ہے کم از کم آپ کی کلاس تو ضرور اٹینڈ کروں گی ورنہ ڈیڈی سے شکایت ہوجائے گی میری۔" وہ میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھی۔

"شکایت کی کیا ضرورت ہے میں خود ہی تمہارے کان کھینچ لوں گی۔" میں مسکرائی۔

"ہائے آنٹی قسم سے اتنا شوق تھا آپ سے پڑھنے کا لیکن اب سارا ختم ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے اپنے آفس کا دروازہ کھولا۔

"کیونکہ اب ایک ایک لمحے کی رپورٹ آپ تک پہنچے گی اور نہ جانے کن کن باتوں پر کان کھنچوانے پڑیں گے۔" وہ ہنسی۔

"تانیا؟" عباس کچھ دور سے اس کی طرف چلا آرہا تھا۔

"عباس!" اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر "ایکسکیوزمی آنٹی" کہہ کر اس کی جانب مڑ گئی۔

وہ دونوں دھیمے دھیمے باتیں کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کلاس رومز کی طرف چل دیئے۔ نفرت کی چنگاریاں میرے وجود کو جلانے لگیں، جب اس نے تمام رنگ باپ سے چرائے تھے تو اس کی والی ہونا کی سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔

میں آفس کا دروازہ بند کر کے اپنی ریوالونگ چیئر پر آ بیٹھی۔ کلاس لینے میں ابھی کچھ د باقی تھی، اپنی پہلی باقاعدہ کلاس مجھے ہی آج لینی تھی۔ سامنے وزنی میز پر ایک ٹائپ شدہ کا پڑا ہوا تھا، یہ میرے ٹوٹوریل گروپ کی لسٹ تھی۔ چند اور ناموں کے درمیان تانیا اور عباس نام اوپر نیچے لکھا ہوا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"بہتر ہوتا کہ یہ لڑکا میرے گروپ میں نہ ہوتا۔" میں نے سوچا۔ "مجھے نہیں معلوم کب میری نفرت کا آتش فشاں پھٹ پڑے اور اسے میرے ہاتھوں نقصان پہنچ جائے۔"

آفس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"لیس۔"

دروازہ تھوڑا سا کھلا اور تانیا نے اندر جھانکا۔ "آنٹی آپ مصروف تو نہیں ہیں؟"

"تمہارے لئے میں کبھی مصروف نہیں ہوتی۔" میں نے اسے پیار سے دیکھا۔

وہ پیچھے مڑی "آجاؤ اندر" اور پھر اندر چلی آئی۔

اس کے پیچھے پیچھے لڑکے لڑکیوں کا ایک پورا گروپ چلا آیا اور سبھی بلاتکلف و براجمان ہو گئے۔ آنے والوں میں عباس سب سے نمایاں تھا۔

"آنٹی ایک مسئلہ ہے؟"

"کیا؟"

"آپ نے اپنا ٹوٹوریل گروپ دیکھا ہے؟"

میں نے لسٹ اٹھالی۔ "ہاں نام مل گئے ہیں مجھے۔"

"اس میں ہمارے ایک بہت اچھے دوست کا نام نہیں ہے۔"

"کس کا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے سب کو دیکھا۔

"پہلے تعارف تو کرادو ہمارا۔" آنے والی ایک لڑکی نے مداخلت کی۔

"ارے ہاں اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" وہ میری طرف مڑی۔ "آنٹی یہ عباس ہے۔" اس نے میرے عین مقابل بیٹھے ہوئے عباس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ندرت، ظہیر، صبا اور جواد ہیں۔"

میں نے باری باری سب کو دیکھا۔

"یہ جو ندرت ہے ناں۔" اس نے کنارے کی کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بہت اچھی ایتھلیٹ ہے، ٹریک ایونٹس میں اس کا جواب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاس میں لیکچر کے دوران جس کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے یہ سب سے پہلے دوڑ کر لائبریری سے وہ کتاب ایشو کروالیتی ہے اور پھر اس وقت واپس کرتی ہے جب ساری کلاس رو دھو کر اس کتاب پر فاتحہ پڑھ چکی ہوتی ہے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" اس نے بلیئر باب میں کٹے ہوئے بال جھلائے۔ "تم سب کو مفت میں فوٹو سٹیٹ نہیں دیتی کیا؟"

"مفت!" جواد چلایا۔ "اور وہ جو چائے کے کپ اور سموسے ٹھونستی ہو وہ کس کھاتے میں جاتے ہیں۔"

"مر مر کے ایک دفعہ چائے پلادی اس کا احسان اب تک جتا رہے ہو۔" ندرت نے منہ پھلالیا۔

"اب لڑنا مت شروع کر دینا۔" تانیا نے آنکھیں نکالیں پھر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے جواد کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جواد ہے اسے پڑھنے سے زیادہ یہاں کوریڈور میں اپنا موٹر بائیک چلانے کا شوق ہے۔ آپ شاید ہی اسے کبھی کلاس روم میں دیکھیں، اگر یہ لاہور کی بجائے انڈین فلموں میں پیش کئے جانے والے بمبئی میں ہوتا تو یقین کریں اب تک

زیر زمین دنیا کے کسی ڈان یا گاڈ فادر نے اسے گود لے لیا ہوتا۔"

تانیا کی اس بات پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

"کیوں کیا جواد بھی چھ گولیوں والے ریوالور سے جنگِ عظیم دوم میں چلنے والی گولیوں سے دوگنی گولیاں چلا سکتا ہے۔" میں نے دلچسپی سے جواد کی طرف دیکھا جو دیکھنے میں عام سا لڑکا تھا لیکن اس کی آنکھیں بلا کی شوخ تھیں۔

"آنٹی اگر فلموں کا ہیرو ریوالور کو پہلی مرتبہ ہاتھ میں تھامتے ہی کشتوں کے پشتے لگا سکتا ہے تو جواد یہ کیوں نہیں کر سکتا لیکن یہ طے ہے کہ موٹر بائیک کے کرتب دکھانے میں پورے شہر میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور آنٹی آپ تو یہ فلمیں نہیں دیکھتیں ورنہ آپ کو پتا چلتا کہ انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں اس قسم کے کاموں کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔"

میں ہولے سے ہنسی۔ "بہت خوب۔"

"یہ ہے صبا۔" اس نے ربن میں بندھے بالوں والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جس کے بھورے بالوں نے نہ صرف اس کا ماتھا ڈھانپ رکھا تھا بلکہ اس کی آنکھیں بھی کسی حد تک چھپا رکھی تھیں۔

"یہ بالکل بادِ صبا کی طرح آہستہ رو اور سبک خرام ہے۔ وہی دیکھتی ہے جو دیکھنا چاہتی ہے اس لئے اس کے بال اس کی آنکھوں پر ہمیشہ سایہ فگن رہتے ہیں۔ جو کچھ بھی اس کے سامنے ہوتا ہے وہ بالوں سے فلٹر ہو کر اس کی آنکھوں تک پہنچتے پہنچتے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔"

صبا کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اب یہی دیکھ لیں آنٹی کہ اسے یہ سب باتیں بھی تعریف کا ایک انداز ہی دکھائی دے رہی ہیں۔"

اس کی بات سن کر صبا ہولے سے ہنس دی بالکل جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم لیکن بولی وہ اب بھی کچھ نہیں، میرے خیال میں تانیا اس کے متعلق یہ بتانا بھول گئی تھی کہ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والی ایسی لڑکی تھی جو کسی بھی محفل میں بیٹھے بیٹھے اس سے ناتا توڑ کر اپنے خوابوں اور خیالوں کی ایک الگ محفل سجا سکتی ہے۔ یہ خول اپنی خوشی یا عافیت کے لئے وہ

کبھی بھی چڑھا سکتی تھی اور اتار بھی سکتی تھی۔

"اور آنٹی یہ ہے ہمارا دوست کامریڈ ظہیر اور مسئلہ بھی اسی کا ہے۔" اس نے اول جلول سے حلیے والے لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔

کامریڈ ظہیر کے لمبے بال کنگھی کے لئے ترس رہے تھے، اس کی میلی جینز چیخ چیخ کر دھلنے کے لئے فریاد کر رہی تھی اور وہ پاؤں ہلا ہلا کر اپنے پھٹے ہوئے جوگرز کو اور زیادہ نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے پورے وجود میں سب سے کم پرانی وہ داڑھی تھی جو تقریباً پانچ دن قبل سے اس کے منہ پر اُگ رہی تھی اور سب سے صاف چیز نظر کا وہ چشمہ تھا جو اس کی ناک پر رکھا ہوا تھا۔

"سوویت یونین کی وفات حسرت آیات کے باوجود بھی یہ کامریڈ کہلانا پسند کرتا ہے اور ابھی تک کارل مارکس کو اپنا گرو مانتا ہے۔"

"میڈم ان کے خیال میں کیمونزم اپنی موت مر چکا ہے لیکن میرا خیال بالکل مختلف ہے۔" اس کا پھٹا ہوا جوگر شوز تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ "انتقال تو درحقیقت سوویت یونین کا ہوا ہے مارکسزم کا نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سوویت یونین مارکسزم کا گڑھ تھا وہ نہ صرف جھوٹ بولتے ہیں بلکہ مارکسزم کی توہین بھی کرتے ہیں۔ وہاں کی حکومت اور عوام کا مارکسزم سے صرف اسی قدر تعلق تھا کہ وہ اس کے نام کے ہجے جانتے تھے اور کچھ نہیں۔"

"آل رائٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا کیونکہ اس قسم کی تقریر سننے کو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

"تو دیکھی آنٹی آپ نے اس کی کارل مارکس سے محبت۔" تانیا ہنسی۔ "انقلاب اس کی سب سے بڑی خواہش ہے لیکن آج تک اس کا یہ انقلاب چائے کی پیالی سے باہر نہیں نکل سکا۔"

میرے ذہن میں جنید کی شکل ابھر آئی، وہ بھی اسی طرح انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا تھا۔ لفظ انقلاب اس کے لئے سنسنی خیز رومانس تھا، نہ جانے وہ کہاں تھا، میں تو اس طرح ملک سے باہر گئی تھی کہ پھر پلٹ کر کسی کی خبر ہی نہیں لی۔

"اور آنٹی یہ ہماری کلاس کا سب سے لائق سٹوڈنٹ ہے عباس، بہت ہی اچھا اور اتنا

ہی برا دوست۔'' تانیا نے عباس کی طرف دیکھا۔'' کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کس بات پر اکتاہٹ کا اظہار کرنے کے لئے برف کا لبادہ اوڑھ لے اور کب ستی ساوتری کی طرح اپنی دوستی کو بچانے کے لئے آگ میں کود پڑے۔''

اس کی اس بات پر سب ہی ہنس پڑے۔

''ستی ساوتری نے دوستی کو نہیں اپنے شوہر کو آگ سے نکالا تھا۔'' کامریڈ ظہیر بولا۔

''تو کیا ہوا یہ ہر صبح اپنی ذات کی آرتی اتارتا ہے اور اپنی دوستیوں کے لئے مرن برت تک رکھ سکتا ہے اور جب ان کاموں سے فارغ ہوتا ہے تو مُرلی لے کر بیلے (جنگل) میں نکل جاتا ہے۔ ویسے اصولاً ایسے وقت میں اسے جنگل کی بجائے تبت کا رخ کرنا چاہئے۔''

''بالکل غلط۔'' جواد ہاتھ اٹھا کر چلایا۔''پھر تو یہ برف کے ساتھ مل کر خود برف کا حصہ ہو جائے گا اور تم سب جانتے ہو کہ اپنی شناخت اور اپنا آپ ثابت کرنے کے معاملے میں یہ کس قدر Ambitious ہے، کیوں اس کی Individual ختم کرانے پر تلی ہوئی ہو۔''

میں نے اپنے مقابل بیٹھے ہوئے عباس کو دیکھا، تھوڑی دیر پہلے تک وہ سر سے پاؤں تک برف اوڑھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا So What انداز اور Who Carees قسم کا رویہ اس کے چہرے پر منجمد تھا اور وہ ایسی بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا جیسے میرے دفتر کی بجائے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہو لیکن تانیا کی بات سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور ساری برف پگھل گئی۔

میرے ذہن میں جیسے کسی نے دستک دی، اس کی مسکراہٹ بالکل انیس شاہ جیسی تھی۔ اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ لڑکیاں اس کے آتے ہی اتنی الرٹ کیوں ہو جاتی تھیں۔ ان کی آوازوں میں اتنا لوچ کیوں پیدا ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں ستارے کیوں اتر آتے تھے۔ خود انیس شاہ بھی یہ سب جانتا تھا، بس اوپر اوپر سے بے نیاز رہتا تھا اور اسے اسی بات کی تکلیف تھی کہ میں اور لڑکیوں کی طرح اس کی پذیرائی کیوں نہیں کرتی۔ Self Centered خود غرض، قابلِ نفرت انسان اپنے آپ کو نظر انداز ہوتا کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''اور فرینڈز یہ میری آنٹی ہیں، کوئی عام سی نہیں بہت خاص۔ مجھے میری مما سے زیادہ انہوں نے پالا ہے اور میرے لئے یہ ویسی ہی ہیں جیسی کہ میری مما تھیں۔'' اس نے محبت بھرے انداز میں میری طرف دیکھا۔''مما کی وفات کے بعد یہی تھیں جنہوں نے مجھے سنبھالا اور اپنے سے اتنا قریب کر لیا کہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے میں نے اپنی مما کو پھر سے پا لیا ہو۔''

''ویسے یہ تمہاری آنٹی سے زیادہ بڑی بہن لگتی ہیں۔'' عباس بولا۔

''ہاں یہ تو ہے، لیکن میں انہیں بہت پہلے ہی آنٹی کہتی آ رہی ہوں اور مجھے انہیں آنٹی کہنا ہی اچھا لگتا ہے۔'' اس نے میری کرسی کے پیچھے سے آ کر اپنی بانہیں میری گردن میں حائل کر دیں۔''جب آنٹی نے پاکستان آنے کی بات کی تو میں تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اب بھی یہ ہمارے گھر کی انیکسی میں ہی رہ رہی ہیں اور میں انہیں اب کہیں نہیں جانے دوں گی۔''

میں آہستہ سے ہنس پڑی۔''اب مکھن لگانا بند کرو اور وہ مسئلہ بتاؤ جس کے لئے تم سب یہاں آئے ہو؟''

وہ بھی مسکراتے ہوئے میری میز پر بیٹھ گئی۔

''آنٹی کامریڈ ظہیر کا ٹٹوریل بہت خونخوار قسم کے پروفیسر کے ساتھ لگا ہے۔''

''کس کے گروپ میں ہے یہ؟''

''پروفیسر مجاہدی۔''

''کیوں کامریڈ، پروفیسر مجاہد اتنے خونخوار دکھتے تو نہیں ہیں تمہیں یقین ہے کہ وہ بہت خونخوار قسم کی چیز ہیں۔''

''میڈم سراسر نظریاتی اختلاف ہے۔'' وہ فوراً بول اٹھا۔''آپ کو تو ڈیپارٹمنٹ آئے صرف دو دن ہوئے ہیں ورنہ آپ کو بھی معلوم ہوتا کہ وہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کی سب سے اعلیٰ مثال ہیں۔ وہ Status Quo کے قائل ہیں انہیں جمود پسند ہے۔ ان کا کوئی نظریہ نہیں ہے اور بدقسمتی سے وہ اسی نظریئے پر اڑے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی نظریہ نہیں ہے اور نہ ہی ہونا چاہئے۔ وہ روٹین کے قائل ہیں اور روٹین سے ہٹ کر پتا بھی ہل جائے تو وہ اسے بھی قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ اس کی شدید ترین غلطی ہے۔ ٹھیک ہے یہ ان کا جمہوری حق ہے کہ وہ اس پتے کو قائل کرنے کی کوشش کریں لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ اس کے لئے ایسی بے ہودہ اور غیر مدلل قسم کی دلیلیں دیتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔''

اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اور میڈم مجھے تو دیکھتے ہی وہ اپنے بے نظریئے کے ڈبے کو اس زور زور سے مداری کی ڈگڈی کی طرح بجاتے ہیں کہ میری تمام قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ٹٹوریل میں میری اور ان کی مڈبھیڑ ہو گئی تو ان کی یہ ڈگڈگی ٹوٹے گی یا میرا سر پھوٹے گا لیکن اگر آپ چاہیں تو اس حادثے کو وقوع پذیر ہونے سے روک سکتی ہیں۔''

''یعنی تمہیں اپنے ٹٹوریل گروپ میں شامل کر لوں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''او یس!'' وہ کھل اٹھا۔ ''یہ آپ کی مجھ پر اور مجاہدی صاحب دونوں پر مشترکہ مہربانی ہو گی۔''

''ہوں!'' میں نے لسٹ اٹھا کر اسے ایک نظر دیکھا۔ ''آل رائٹ میں بات کر لوں گی لیکن پھر مجھے اپنے گروپ میں سے ایک سٹوڈنٹ انہیں دینا ہو گا۔''

''دے دیں بے شک دے دیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ہولڈر سے قلم نکال کر عباس کے نام پر سختی سے لکیر کھینچ دی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آنٹی!'' تانیا گھبرا گئی۔ ''عباس کا نام اپنے پاس رہنے دیں یہ ضمیر کا نام کاٹ دیں۔''

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں نہ جانے امید تھی یا التجا۔ میرا دل کرچی کرچی ہو گیا، پہلے باپ، اور اب بیٹا میری زندگی کی خوشیاں چھین رہے تھے۔

''کامریڈ کو یہاں لانے کے لئے ضروری ہے کہ کسی اور سٹوڈنٹ کو پروفیسر مجاہدی کے گروپ میں بھیجا جائے۔''

''لیکن یہ کب ضروری ہے کہ وہ سٹوڈنٹ عباس ہی ہو۔'' تانیا چڑ گئی۔

میں نے عباس کی طرف دیکھا وہ ایسی بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا جیسے یہ بات اس کے نہیں کسی اور کے متعلق ہو رہی ہو۔

''میڈیم پلیز ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا پورا گروپ اکٹھا ہو جائے۔'' صبا پہلی مرتبہ بولی۔

''اور عباس ہمارے گروپ میں بہت اہم ہے۔''

''بہت نہیں سب سے اہم ہے۔'' تانیا نے مجھے قائل کرنے کے لئے اپنی بات پر زور دیا۔

''میڈم اگر عباس کو نکالنے کے بعد ہی میں یہاں آ سکتا ہوں تو پھر رہنے دیں۔ پروفیسر مجاہدی جس زور و شور سے اپنی ڈگڈی بجائیں گے میں اسی زور سے اپنی زبان چلاؤں گا آگے اللہ مالک ہے۔''

''میں کسی خاص وجہ سے عباس کا نام نہیں کاٹ رہی۔ بات یہ ہے کہ ہم ایک اچھا سٹوڈنٹ وہاں سے لیں گے تو ایک اچھا سٹوڈنٹ ہی ہمیں بھی انہیں دینا ہو گا۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا ہے کہ کامریڈ اچھا سٹوڈنٹ ہے۔'' جواد ہنسا۔

''بس آنٹی آپ ضمیر کو گروپ سے نکالیں گی۔'' تانیا نے بیگ سے بال پوائنٹ نکالا اور وہیں میز پر بیٹھے بیٹھے ضمیر کا نام کاٹ دیا۔ ''اس طرح تو ہمارا گروپ بالکل بکھر جائے گا۔ ہم تو ہر جگہ اپنا گروپ اکٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ کامریڈ آ جائے اور عباس چلا جائے تو ہمیں کیا فائدہ بھلا۔'' بات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا قلم بھی حرکت کر رہا تھا، ضمیر کا نام کاٹ کر اس نے کامریڈ ظہیر کا نام لکھ دیا تھا اور عباس نام فہرست میں سب سے اوپر پہنچا دیا تھا۔

''اور اب آنٹی گھنٹی بجا کر بابا دینا کو بلائیں اور اس سے کہیں کہ یہ لسٹ دوبارہ ٹائپ کرنے کے لئے دے دے۔''

''تم فیور لے رہی ہو تانیا!'' میں نے قلم سے میز کے اوپر رکھا ہوا شیشہ ہولے ہولے بجایا۔

''ایکسکیوز می۔'' عباس کھڑا ہوا۔ ''مجھے کچھ کام ہے۔''

''ایک منٹ رکو عباس ہم بھی بس چلنے ہی لگے ہیں۔'' تانیا جلدی سے میز سے اتر آئی۔

''تم لوگ آ جانا۔'' وہ کمرے سے نکل گیا۔

''آنٹی آپ نے اسے ناراض کر دیا۔'' تانیا میری طرف مڑی۔

''ناراض؟ کیسی ناراضگی؟ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے کوئی ناراض ہو جائے۔'' میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''جا کر دیکھو شاید وہ ابھی بھی اپنی ذات کی آرتی اتارنے گیا ہو۔''

''میڈم وہ کامریڈ کی وجہ سے خاموش ہے کیونکہ وہ اسے پروفیسر مجاہدی کے گروپ سے نکالنا چاہتا ہے لیکن اپنے لئے وہ کبھی کوئی فیور قبول نہیں کرتا۔'' جواد بولا۔

''یہ فیور تو تانیا لے رہی ہے۔'' میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''لیکن کس کے لئے؟'' تانیا بولی۔ ''اب آنٹی آپ وہی کریں گی جو میں نے کہا ہے پلیز۔'' اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور جھک کر میرے گال پر پیار کیا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' میں نے گہری سانس لی۔

''تھینک یو آنٹی۔'' وہ کھل اٹھی۔ ''پھر میں چلتی ہوں۔''

''میڈم اگر اس میں مشکل ہے تو رہنے دیں۔'' کامریڈ ظہیر دروازے سے واپس پلٹ آیا۔ ''عباس کا نام تو ویسے بھی اس فہرست میں شامل تھا، اس لئے اس کے یا تانیا کے ساتھ تو فیور کا سوال ہی نہیں، کچھ فیور ہے بھی تو میرے ہی ساتھ ہو رہا ہے۔''

''نہیں فیور کسی کے ساتھ نہیں ہو رہا۔ اگر کچھ ہو بھی رہا ہے تو پروفیسر مجاہدی کے ساتھ، اور اپنے کولیگ کو تم جیسے سٹوڈنٹ سے بچانا اب خواہ مخواہ میری ذمہ داری بن گئی ہے۔''

وہ مسکرا کر باہر نکل گیا۔

مجھے لائبریری سے کچھ کتابیں لینی تھیں، اس لئے ان سب کے جانے کے بعد میں بھی آفس سے نکل آئی۔ کتابیں تلاش کرتے ہوئے الماری کے پیچھے والی کرسیوں سے عباس کی آواز بلند ہوتے ہی میرے کتاب نکالتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گئے۔

''انہوں نے فیور کا ذکر ایسے کیا تھا جیسے تم ان سے میرے لئے کوئی بھیک مانگ رہی ہو۔ اگر مسئلہ کامریڈ کا نہ ہوتا تو میں تمہاری آنٹی سے ضرور کہتا کہ میرا نام تو لسٹ میں تھا ہی۔ مجھے گروپ میں دوبارہ شامل کر کے وہ مجھ پر احسان نہیں کر رہی تھیں۔ یوں بھی مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ بطور خاص انہی سے پڑھوں۔''

''عباس سمجھنے کی کوشش کرو۔'' تانیا کہہ رہی تھی۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، نہ یہ بات کرنے سے آنٹی کا مقصد کسی کو ہرٹ کرنا تھا اور نہ ہی وہ سب جو تم سمجھ رہے ہو۔''

''تم یہ بات نہیں محسوس کر سکتیں کیونکہ تم نے ان کی گود کی گرمی دیکھی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی اس چھوٹی سی بات میں کتنا زہر تھا۔ انہوں نے فہرست سے میرا نام اس

طرح کاٹا تھا جیسے تصور میں میرے گلے پر چھری پھیر رہی ہوں۔''

''کم آن یار کیوں بکواس کرتا ہے۔'' کامریڈ بولا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ندرت نے اسے یقین دلانے والے لہجے میں کہا۔ ''ان کی تم سے کیا دشمنی ہے کہ وہ ایسا کریں گی۔''

''عباس تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔'' تانیا مجروح لہجے میں بولی۔ ''آنٹی میری مما سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں۔ ان کے رویئے تمہاری طرح نامعقول نہیں ہیں۔ تم ان کا گلہ کر رہے ہو حالانکہ گلہ تو مجھے تم سے کرنا چاہئے تھا۔ تم ان کے آفس میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے تمہارا ادھر موجود لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو۔ میری آنٹی سے ملتے ہوئے تمہارے انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔''

''عباس یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' صبا بولی۔ ''بات کوئی نہیں ہوئی لیکن تم نے بتنگڑ بنالیا ہے، تم تو ایسے نہیں ہو عباس۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔''

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا تم لوگوں نے ان کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں جو مسلسل میرا وجود رد کر رہی تھیں۔''

''تو یہ مسئلہ ہے۔'' جواد نے کہا۔ ''اول تو ہم میں سے کسی نے یہ بات نوٹ نہیں کی اور اگر سچ مچ ایسا ہی ہے تو تم اپنا وجود ثابت کر دو ان کے سامنے، انہیں یہ بتا دو کہ تم ہو۔''

''رہنے دو جواد یہ پاگل ہو گیا ہے۔'' تانیا کو غصہ آ گیا تھا۔ ''ہم تو مذاق کرتے تھے کہ یہ اپنا وجود ثابت کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے اس مذاق کو اس قدر سنجیدگی سے لیا ہے کہ اب یہ عقل اور ہوش کی حد پھلانگ کر جنون اور پاگل پن کی حدود میں چلا گیا ہے۔''

''تم سب کو کیا ہو گیا ہے؟'' ندرت الجھ پڑی۔ ''مجھے تو یہ لگتا ہے کہ تم سب پاگل ہو گئے ہو، آخر کچھ وجہ بھی تو ہو لڑنے کی۔''

''یہ کم وجہ ہے کہ یہ خواہ مخواہ میری آنٹی پر الزام لگا رہا ہے تم سب تھے وہاں، بھلا انہوں نے کوئی ایسی بات کہی تھی جو ناگوار گزرے۔''

''میں نے بچپن سے ہی رویئے اور تاثرات سمجھنے سیکھ لئے تھے جس گہرائی میں میں اترتا وہاں تم لوگ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے، سطح پر ہی ہچکولے کھاتے رہتے ہو۔''

"بہت خوب!" تانیا کا پارہ اب بھی چڑھا ہوا تھا۔ "یہی کسر رہ گئی تھی کہ اب اپنی تعریف اپنے منہ سے کرو۔ مانا کہ ہم سطح پر ہی رہتے ہیں لیکن جس گہرائی میں تم خوامخواہ اتر جاتے ہو، وہاں کوئی آکٹوپس کسی دن تمہیں ایسے جکڑے گا کہ پھر سطح پر واپس چلے آنا خواب ہو جائے گا۔"

"بند کرو یہ بکواس میں عاجز آ گیا ہوں۔" کامریڈ واقعی ان کی لڑائی سے تنگ آیا ہوا لگ رہا تھا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ اس وقت تم دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک رائفل دے دی جائے تو تم ایک دوسرے کا قلع قمع کرنے سے بھی دریغ نہیں کرو گے۔"

"تمہارا نہ قلع قمع کردوں میں۔" عباس ہنسا۔ "کیوں تانیا؟"

"بالکل پہلی گولی کامریڈ پر ہی چلے گی، ہم کیوں ایک دوسرے کو مارنے لگے۔" تانیا نے بھی پلٹا کھایا۔

"تم کیوں پڑے بیچ میں، پتا بھی ہے کہ یہ دونوں لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جاتے ہیں۔" ندرت ہنسی۔

"میری توبہ جواب درمیان میں آیا، مجاہدی کے ہاتھوں بچ بھی گیا تو ان دونوں کے ہاتھوں کسی دن قتل ہو جاؤں گا۔"

"چلو بھئی ان کی صلح کی خوشی میں کنٹین چلتے ہیں۔" جواد کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں الماری کی اوٹ میں کھڑی انہیں باتیں کرتے ہوئے لائبریری سے باہر نکلتے دیکھتی رہی۔ عباس نے غلط نہیں کہا تھا کہ میں اسے رد کر رہی تھی۔ یہ بھی درست تھا کہ اس کا نام کاٹتے وقت اگر میرے ہاتھ میں چھری ہوتی تو میں اسے اتنی ہی شدت سے اس کے گلے پر پھیر دیتی لیکن حیرت یہ تھی کہ میں جو اپنے تمام تر تاثرات بہت کامیابی سے چھپا لیتی تھی کیا آج اس کوشش میں ناکام ہو گئی تھی یا پھر عباس ہی میرے اندر تک اتر گیا تھا؟

کلاس میں وہ سب سے پیچھے تھا اور تانیا سمیت سبھی دوست پچھلی نشستوں پر براجمان تھے۔ میں ان دونوں کو اکٹھا نہیں دیکھنا چاہتی تھی، پہلے اس کے باپ نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا اور اب اسی کا بیٹا میری تانیا کو اپنے جال میں پھنسا رہا تھا۔ وہ ایک مکڑے کی طرح گھات لگائے بیٹھا تھا اور تانیا کو جالے میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ میری تانیا بہت

معصوم، بھولی اور سیدھی تھی، خدا معلوم کب اس کی باتوں میں آ جاتی۔ میں بے دلی سے لیکچر دے کے باہر نکل آئی۔

"آنٹی!" تانیا تیز تیز قدموں سے میرے پیچھے چلی آئی۔

"ہوں۔"

"آپ نے مجاہدی صاحب سے بات کی ہے؟" وہ میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔

"مجھے وقت تو دو، میں مصروف تھی۔"

"آنٹی اگر کوئی مسئلہ ہو تو رہنے دیں، کامریڈ ان کے گروپ میں رہ لے گا۔ جہاں اتنی کلاسز اٹینڈ نہیں کرتا وہاں ٹیوٹوریل مس کرنے سے کیا ہو جائے گا اس کا۔"

"کامریڈ سے میں وعدہ کر چکی ہوں اس لئے وہ تو میرے گروپ میں آ جائے گا، اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"تو پھر ضمیر کو مجاہدی صاحب کے حوالے کر دیں۔"

"تم کیوں چاہتی ہو کہ عباس لازمی اس گروپ میں رہے جس میں تم ہو؟" میں نے آفس میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

تانیا نے چند ثانیے الجھن سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "آنٹی آپ کیوں چاہتی ہیں کہ ہم دونوں کے گروپ الگ الگ ہوں؟" پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ "آئی ایم سوری مجھے آپ سے یہ بات نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن مجھے آپ کی بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی، ہم دونوں دوست ہیں، بہت اچھے۔"

"صرف تم دونوں ہی اچھے دوست ہو؟"

"ہم سب اچھے دوست ہیں چھ کے چھ۔ ہم اپنا گروپ ہر جگہ مکمل رکھنا چاہتے ہیں۔ کامریڈ آ گیا اور عباس چلا گیا تو پھر کامریڈ کا گروپ بدلوانے کا فائدہ؟"

"تم نے مجھے بہت الجھا دیا ہے تانیا!" میں ہولے سے بولی۔

"میں نے تو کچھ نہیں کہا آنٹی، ایک چھوٹی سی بات کی تھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا کہ آپ کیوں الجھ رہی ہیں اور مجھے کیوں الجھا رہی ہیں۔"

"آل رائٹ کامریڈ بھی میرے گروپ میں آجائے گا اور عباس بھی یہیں رہے گا۔ اب تم جاؤ مجھے کچھ پڑھنا ہے۔"

وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

میں تانیا کو ہرگز یہ محسوس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ عباس جو کچھ سوچ رہا ہے وہ درست ہے لیکن میرے منہ سے خوامخواہ ہی اپنی الجھن کا ذکر نکل گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں پروفیسر مجاہدی کے آفس میں آ گئی۔ کامریڈ نے ان کے بارے میں بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔ وہ ایکسٹینشن پر تھے اور ابھی تک تقسیم ہند سے پہلے کے علم پر چل رہے تھے۔ کامریڈ سے متعلق میری درخواست سن کر تو وہ اچھل ہی پڑے۔

"ارے وہ لڑکا جس کے دماغ میں انقلاب کا بھوسا بھرا ہوا ہے۔"

"اس کے دماغ میں بس بھوسا ہی ہے انقلاب وغیرہ کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ ابھی اسے جانتی نہیں ہیں، وہ اس پورے معاشرے کو تبدیل کرنے پر تلا ہوا ہے، انقلاب لانے کی باتیں کرتا ہے۔"

"لاسکتا ہے۔" میں ہنسی۔ "آپ تو اتنے سینئر پروفیسر ہیں آپ کو تو معلوم ہوگا کہ ہر کالج یونیورسٹی کے ہر سیشن میں ایک نہ ایک انقلابی ضرور آتا ہے۔ اس حساب سے تو ہر سال کم از کم ایک انقلاب ضرور آنا چاہئے۔"

"وہ مارکسزم کا قائل ہے۔" مجاہدی صاحب کے نزدیک اسے مسترد کر دینے کے لئے فقط یہ کہہ دینا ضروری تھا۔

"مجھے ایک عرصہ تک امریکہ میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، وہاں بھی سب مارکسزم سے بہت ڈرا کرتے تھے لیکن میرے خیال میں اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا یہاں اس لفظ سے ڈر جاتا ہے۔ مجاہدی صاحب، یہ صرف وقت گزارنے کا بہانہ ہے، کامریڈ صرف کریکر ہے اسے بم دھماکہ بنا کر اس کی اہمیت میں اضافہ نہ کریں۔"

"تو آپ اسے اپنے گروپ میں لینا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کے گروپ میں تو پہلے ہی جواد جیسا لڑکا موجود ہے جس کا کام صرف بائیک

کے کرتب دکھانا ہے۔ یہ دو اکٹھے ہو گئے تو انہیں قابو کرنا مشکل ہو جائے گا آپ کے لئے۔"

ان کی بات سن کر مجھے ہنسی تو بہت آئی لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "جواد کلاس اٹینڈ ہی کب کرتا ہے اور جب وہ کلاس میں نہیں ہوگا تو ان دونوں کے اکٹھے ہونے کا کیا سوال؟"

"آپ کہتی ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔" لیکن ان کا لہجہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ ماننا چاہتے نہیں تھے۔ "سچ پوچھیں تو ڈاکٹر سعدیہ، مجھے ایسے لوگ پسند بھی نہیں ہیں جو مجھے چیلنج کریں۔ آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے میں نے یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کئے لیکن آج کل کے لڑکے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ انہی کو معلوم ہے اور ہم تو اتنے سال گھاس ڈھوتے رہے ہیں۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"آپ ایسا کریں کہ مجھے کوئی بیبا سا لڑکا دے دیں جو نہ صرف میری باتیں سنے بلکہ ان پر عمل بھی کرے۔"

اور یوں مسئلہ حل ہو گیا۔

گھر جاتے ہوئے تانیا چپ چاپ تھی۔

"کیا ہو گیا تانیا بیٹے اتنی خاموش کیوں ہو؟" میں نے پیار سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں کوئی بات ہی نہیں ہے کرنے کو۔"

"تمہاری عمر کی بچیوں کے پاس تو باتیں ختم ہی نہیں ہونی چاہئیں۔" میں بولی۔ "مجھ سے ناراض ہو گیا؟"

"آپ سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"میں نے تمہارا مسئلہ حسب وعدہ حل کر دیا ہے۔" میں نے ونڈ شیلڈ سے پار سڑک پر آگے دوڑتی ہوئی گاڑیوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین تھا آپ میری کوئی بات رد نہیں کرتیں۔" وہ ہنس پڑی۔

مجھے اس کی ہنسی بہت عزیز تھی۔ اسے سن کر کچھ دیر کے لئے میں رونے کی وہ آواز بھول جاتی تھی جب میرا امراد مجھے مدد کے لئے پکار رہا تھا اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکی تھی۔

میں اپنی تانیا کی ہنسی ہمیشہ کے لئے اس کے ہونٹوں پر محفوظ کر دینا چاہتی تھی۔ اس کی خوشگوار، نرم پھوار جیسی ہنسی میں تو ہمیشہ کے لئے ہنسنے سے محروم کر دی گئی تھی اور اب ہر رات تڑپتی تھی اور ہر صبح اپنے چہرے پر خوشگواریت اور طمانیت کا نقاب چڑھا لیتی تھی۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ:

''کاغذ پہ بنی ہوئی مسکراہٹ
ہونٹوں پر چپکانے سے
زندگی میں غروبِ آفتاب کا منظر نہیں بدلے گا''

پھر بھی ہر روز مسکراہٹوں کا یہ ماسک چہرے پر پہن لیتی تھی اور اس معاشرے کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے تنہائی کا کوئی بچھو ڈنک نہیں مارتا، کرب کے سانپ اپنی دومونہی زبانیں لپلپاتے ہوئے میری جانب نہیں بڑھتے اور عذابوں کی بھڑوں کا چھتا میرے گھر کی کسی دیوار پر نہیں ہے۔ اگر میں ہر روز ریاکاری کا یہ نقاب اپنے چہرے پر نہ سجاتی تو رحم، ہمدردی، ترس اور سوالوں کے تیر میرے پہلے سے چھلنی دل و دماغ کو اور زیادہ چھلنی کر دیتے۔

تانیا اور اس کے دوست فارغ اوقات میں میرے کمرے میں ڈیرے ڈال دیا کرتے تھے۔ بس عباس ہی تھا جو مارے باندھے آتا تھا باقی سب تو آتے ساتھ ہی کسی نہ کسی مسئلے کو چھیڑ دیتے تھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اس قدر زور و شور سے بحث کرتے تھے کہ کوئی ایک دوسرے کی بات نہیں سن سکتا تھا۔ یہ نہیں کہ عباس گفتگو میں حصہ نہیں لیتا تھا، بس یہ تھا کہ وہ وہاں اپنی خوشی سے نہیں آتا تھا اور بات کرتے ہوئے نہ تو کامریڈ ظہیر کی طرح اپنے پاؤں کو مسلسل جنبش دیا کرتا تھا اور نہ ہی تانیا کی طرح میز پر ہاتھ مار مار کر اپنے دلائل سب کے کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ کرسی پر یوں بے نیازی سے بیٹھا رہتا تھا جیسے کہ وہاں موجود ہی نہ ہو، لیکن پھر اچانک کسی پوائنٹ پر جب گفتگو میں حصہ لیتا تو سب کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ واقعی سب کے درمیان بیٹھا ہوا ہر بات بغور سن رہا ہے۔

اس دن بھی جب میں فائنل کی کلاس لے کر آفس میں داخل ہوئی تو وہ سب وہیں براجمان تھے اور حسبِ معمول ایک دوسرے کی بات سنے بغیر اپنی کہے جا رہے تھے۔

''تم سب کیوں لڑ رہے ہو مسئلہ کیا ہے؟''

''آنٹی ہم لڑ نہیں رہے ہم بحث کر رہے ہیں۔'' تانیا نے مربیانہ انداز میں میری تصحیح کی۔

''حیرت ہے مجھے تو سیڑھیوں تک تمہارے شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔ شک ہو تو ایک بار پھر ویسے ہی بولنا شروع کرو اور باری باری باہر جا کر سنو۔ کسی چھوٹی موٹی سول وار کے آثار سنائی دیں گے۔''

وہ ہنس پڑے۔

''میڈم ہم تقدیر اور تدبیر کے متعلق بات کر رہے تھے۔'' کامریڈ بولا۔ ''اصل میں بات یوں شروع ہوئی تھی کہ اس مرتبہ پھر لڑکیوں کی کھیلوں پر پابندی لگ گئی ہے اور ندرت کا خیال ہے کہ اس کی قسمت ہی خراب ہے۔''

''تو اور کیا ایک مرتبہ اجازت ملی تھی تب میں بیمار ہو گئی تھی اور اب یہ پابندی لگ گئی ہے، قسمت خراب نہ ہوئی تو اور کیا ہے۔'' ندرت بولی۔

''لیکن میڈم ہم لڑکوں کا خیال ہے کہ تقدیر کو بدلا جا سکتا ہے لیکن لڑکیاں یہ ماننے پر تیار نہیں ہیں۔''

''تم لوگ ہر اس موضوع پر بات کرتے ہو جسے صدیوں سے کوئی حل نہیں کر سکا اور یقین کرو کہ تم لوگ بھی میرے آفس کے قالین پر آلتی پالتی مار کر اور پھلوں کے چھلکے پھینک کر اسے حل نہیں کر سکو گے۔''

''میڈم تقدیر تو ہمارے ایمان کا بنیادی جزو ہے۔'' ندرت بولی۔ ''اور تقدیر سے انکار کرنے والا دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس طرح سب سے پہلے کامریڈ اس حلقے سے نکلتا ہے۔ اس کے لئے بحث کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کارل مارکس کی قبر میں گھس کر بعد از سلام عاشقی اس سے پوچھے کہ وہ اپنی تقدیر سے لڑ کر سوویت یونین کو پھر سے چند سانسیں دینے کے لئے کفن پھاڑ کر باہر کیوں نہیں نکل آتا۔''

''یہ سراسر فاؤل ہے، کارل مارکس کو بیچ میں لائے بغیر بات کرو ورنہ یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔'' کامریڈ چلایا۔ ''میڈم آپ ہی فیصلہ کریں ہر ایک کو مرنا تو ہے ہی، اس سے کون انکار کر سکتا ہے مرنے سے تقدیر کا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ موت ایک سربستہ راز

ہے اور تقدیر و تدبیر زندگی کے جھمیلے ہیں۔''

''تم ایک ٹانگ اٹھا کر بھی کھڑے رہنے کے قابل ہو تو یہ تدبیر ہے لیکن میں تمہاری تدبیر کو اس وقت مانوں گی جب تم دونوں پاؤں اٹھا کر کسی سہارے کے بغیر ہوا میں معلق ہو جاؤ۔'' تانیا اس سے بھی زیادہ زور سے چلائی۔

''سائنس روز بروز ترقی کر رہی ہے اور یہ ترقی تدبیر سے ہی ممکن ہے، ہو سکتا ہے کل یہ بھی ممکن ہو جائے۔'' کامریڈ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''میڈم یہ تو یونہی مر جائیں گے کیا آپ اس حادثے کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کے لئے کچھ نہیں کریں گی؟'' صبا گھبرا کر بولی۔

''ہاں آنٹی آپ بتائیں کہ تدبیر کی حد کہاں تک ہے اور تقدیر کی پرواز کہاں تک۔''

''پتا نہیں۔'' میں بولی۔'' کیونکہ میں اب تک اس گورکھ دھندے کو سمجھنے میں ناکام رہی ہوں، ہاں شیکسپیئر کا کہنا ہے کہ:

As flies to wanton boys, are we to the Gods. They kill us for their sport

(جس طرح شرارتی بچوں کے لئے مکھیاں ہیں اسی طرح دیوتاؤں کے لئے ہم ہیں۔ وہ ہمیں اس لئے مار دیتے ہیں تا کہ اس کھیل سے لطف اندوز ہوں)

''میڈم، شیکسپیئر تو یہ بھی کہتا ہے کہ'' عباس بولا:

Men at some times are the masters of their fate. The fault dear brutus is not in our stars. But in our selves that we are underling.

(انسان بعض اوقات اپنی تقدیر پر حکومت کر سکتا ہے اچھے بروٹس۔ غلطی ہماری تقدیر اور ہمارے ستاروں میں نہیں جس کی وجہ سے ہم خوار اور زبوں ہیں)

''اور میرے خیال میں وہ کچھ غلط نہیں کہتا۔'' عباس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور پھر جوش ملیح آبادی کہتے ہیں کہ آتش بازی اور عقائد میں بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح آتش بازی دن کی روشنی میں زرد اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہے اور تاریکی بڑھ جائے تو اس کا

جوبن ابھر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح عقائد علم و فکر کی روشنی میں جھینپے جھینپے اور مدھم نظر آتے ہیں اور جہل کی تیرگی میں جگمگاتے اور مونچھوں پر تاؤ دینے لگتے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ہم تقدیر کو ڈھال بنا کر اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے بہانے تلاش کر لیتے ہیں۔ آج تدبیر کے ذریعے جو کچھ ممکن نہیں ہے کل کا انسان اسے یقیناً ممکن بنا دے گا۔''

''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا راستہ کوئی تدبیر نہیں روک سکتی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''گناہ و عذاب کے بیج سے پیدا ہونے والا اپنی پیدائش کو کس تدبیر سے روک سکتا ہے اگر اوپر والا اسے نہ روکنا چاہے تو؟''

عباس کی آنکھوں میں کچھ تلاطم سے پیدا ہوئے۔ ''میڈم تعلق غیر قانونی اور ناجائز ہو سکتے ہیں کوئی انسان نہیں۔''

پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر تیزی سے آفس سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی کمرے میں چند لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا، بالآخر تانیا نے اس خاموشی کو توڑا۔

''عباس کیوں اچانک چلا گیا؟''

پتا نہیں ہم بھی لاعلم تھے۔

''کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حاصل کرنے، فتح کرنے کے نشے میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوتے ہیں اور جب ان کی راہ میں شکست کے آثار آ جائیں تو وہ فتح کی خواہش میں تمام تر اصولوں اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں یا پھر راہ ہی بدل لیتے ہیں۔ آئی ایم سوری لیکن مجھے تم لوگوں کا یہ دوست انہی لوگوں میں سے ایک لگتا ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔

تانیا ایک بار پھر الجھ گئی لیکن یہ الجھن اس کی آنکھوں تک ہی محدود تھی۔

''کیا خیال ہے چائے منگواؤں؟'' میں نے سب کی طرف دیکھا۔

''بہت نیک خیال ہے۔'' جواد جلدی سے بولا

اور چائے کے ایک ایک کپ کے ساتھ بالآخر یہ بات بھی ختم ہوگئی۔

''آنٹی شام کو ڈنر پر تیار رہنا۔'' تانیا کو جاتے جاتے یاد آیا۔

''کیوں؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''بس یونہی ڈیڈی بور ہو رہے تھے سوچا کہ گیٹ ٹو گیدر (Get to gether) کر لیا جائے۔''

''اچھا میں تیار رہوں گی۔''

میرا خیال تھا کہ تانیا کے ڈیڈی فیضان علی شاہ نے بوریت سے بچنے کے لئے یونہی دو چار قریبی دوست اکٹھے کر لئے ہوں گے لیکن وہاں تو خاصا بڑا انتظام تھا اور بہت سے لوگ پہنچ بھی چکے تھے۔

''آؤ سعدیہ!'' انہوں نے میرا استقبال کیا۔

''آپ نے تو بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر رکھا ہے۔'' میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ ''میرا خیال تھا کہ یونہی کوئی چھوٹی موٹی پارٹی ہوگی۔''

''بس یونہی گپ شپ کو دل چاہ رہا تھا اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' پھر انہوں نے تانیا کو آواز دی۔

''جی ڈیڈی!'' وہ بھی وہیں آ گئی۔

''اپنی آنٹی کو مہمانوں سے ملاؤ، ان کے لئے یہ سب لوگ نئے ہیں کہیں بوریت محسوس نہ کرنے لگیں۔''

''نہیں ڈیڈی یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں یہ بالکل بور نہیں ہوں گی۔''

وہ ایک ایک کر کے مہمانوں سے میرا تعارف کروانے لگی۔

''اور آنٹی یہ ہیں جنید صاحب۔''

''سعدیہ تم؟'' یہ وہی انقلابی جنید تھا اس کی آنکھوں میں مسرت بھری حیرانگی اتر آئی۔

''میں تو یہاں ہی ہوں کیونکہ یہ میرا شہر ہے لیکن تم یہاں کیسے؟'' میں بھی اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی لیکن یہ حیرت خوشگوار تھی۔

''تو آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' اس سے قبل کہ جنید کچھ کہتا تانیا بول پڑی۔

''اس کا مطلب ہوا کہ میری چھٹی۔''

''میں پچھلے ایک سال سے یہیں ہوں۔'' تانیا کے جانے کے بعد وہ بولا۔ ''تم سے کچھ زیادہ دور نہیں رہتا یہیں جی او آر ون میں مکان ملا ہے۔''

''جی او آر ون؟ یعنی تم نے سی ایس ایس کر لیا۔''

''ہاں ڈی ایم جی میں ہوتا ہوں۔''

''پھر تو تم نے اپنی انقلابی تھیوریز کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ہوگا۔''

''انقلاب؟'' وہ ہنس پڑا۔ ''وہ دن گزارے تو زمانہ ہوگیا، انقلاب کو تو میں نے اسی دن دفن کر دیا تھا جس دن ڈیڈی کے زور دینے پر میں سول سروس کا پہلا پرچہ دینے اس پھٹیچر سے فرنیچر والے سکول گیا تھا۔''

میں بھی ہنس پڑی۔ ''مجھے اس انقلاب کی تاریخ ولادت کا تو پتا نہیں لیکن میں نے اس کی تاریخ وفات کا تعین کر لیا تھا۔''

''اور تم تو ایسی گئیں کہ پلٹ کر خبر بھی نہیں لی۔''

''میں ہر گزرا ہوا کل بھول جانے کی عادی ہوں۔'' پھر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔

''تمہاری وائف تمہارے ساتھ نہیں آئی؟''

''کیسے آسکتی تھی بیچاری جب ہے ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟ اب تک شادی نہیں کی تم نے؟''

''یہ بہت لمبی کہانی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں تمہارے انکار سے بھی نہیں ہارا تھا اور تمہیں ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے ذرا سی دیر ہوگئی تھی اور تم امریکہ جا چکی تھی، پھر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

''یہ کیا بیوقوفی کی بات ہے۔''

''ہاں جلد ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ یہ بیوقوفی ہی نہیں حماقت کی انتہاء ہوگی اس لئے میں نے اپنے پچھلے خیال پر نظر ثانی کر لی اور سوچا کہ مجھے شادی کر ہی لینی چاہئے لیکن ذرا اسٹیبلش ہونے کے بعد پھر اسٹیبلش ہوتے ہوتے ہی کافی وقت گزر گیا۔ تب ایک مرتبہ پھر خیال آیا کہ اب بالآخر شادی ہو ہی جانی چاہئے لیکن جب اپنی عادتوں پر نظر ڈالی تو اس خیال

پر بھی نظر ثانی کر لی۔ میری ان موجودہ عادتوں کے ساتھ کم از کم اس سیارے میں بسنے والی عورت گزارہ نہیں کر سکتی اور یہ عادتیں میں چھوڑ نہیں سکتا۔''

''پھر تو اچھا ہی ہوا کہ تم نے شادی نہیں کی اور کسی عورت بیچاری کی ساری زندگی سر پیٹتے ہوئے بسر نہیں ہوئی۔''

''آئیں آنٹی آپ کو ایک خاص مہمان سے ملوانا ہے۔'' تانیا میری طرف چلی آ رہی تھی۔

میں جنید سے معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی، تانیا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لے چلی۔

''یہ ہیں عباس کے ممی اور بابا۔'' اس نے ظفر علی شاہ اور ساتھ کے ساتھ کھڑی بنی ٹھنی درمیانی عمر کی عورت کی طرف اشارہ کیا۔

میری آنکھوں میں نفرت اتر آئی۔

''آل رائٹ مان لیا کہ یہ بلیک میلنگ نہیں ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر انیس نے یہ شغل کر لیا تم بتاؤ کتنی رقم لے کر اپنا منہ بند کرو گی۔'' میرے کانوں میں برسوں پہلے کی اس عورت کی آواز گونجی اور میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

لیکن تانیا میری حالت سے بے خبر کہے جا رہی تھی۔ ''اور یہ میری سب سے اچھی آنٹی ہیں، نہ صرف آنٹی بلکہ اب تو استاد بھی ہیں۔''

ظفر علی شاہ اور اس کی بیوی کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی کرن نہیں اُتری، حالانکہ وہ دونوں ہی مجھے کبھی ماضی میں مل چکے تھے۔ البتہ رسم کی بجلی کے چند کوندے ان کی آنکھوں میں مجھے نظر آ رہے تھے۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''لیکن مجھے ہرگز نہیں ہوئی۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''کیونکہ آپ تانیا کے ساتھ ساتھ ہمارے سب سے پیارے بیٹے عباس کو بھی تعلیم دے رہی ہیں۔'' وہ اپنی دھن میں کہہ رہے تھے۔

''جی شکریہ۔'' میں نے ریاکاری کا نقاب چڑھا لیا لیکن میرے انداز میں ذرا برابر بھی گرمجوشی نہیں تھی۔ اتنے سالوں نے سمجھوتا کرنا تو سکھا دیا تھا، خول چڑھانا بھی میں سیکھ گئی تھی

لیکن بہت مشکل کے ساتھ۔

میں کھانا زہر مار کر کے جلد ہی محفل سے اٹھ آئی اور اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی۔

''کیونکہ آپ تانیا کے ساتھ ساتھ ہمارے سب سے پیارے بیٹے عباس کو بھی تعلیم دے رہی ہیں۔'' ظفر علی شاہ کی آواز میرے کانوں میں ابھری۔

''عباس ظفر علی شاہ کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے سوچا۔ اس شام انیس شاہ اپنے بیٹے کو پیار کرتے ہوئے عباس کے نام سے مخاطب کر رہا تھا اور پھر عباس تو اس سے اس حد تک مشابہہ تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے زمانہ واپس پلٹ گیا ہو یا اس نے عباس کی صورت میں دوسرا جنم لیا ہو۔ ظفر شاہ کے تینوں بچے تو اس وقت بھی کافی بڑے بڑے تھے میں نے یہی سن رکھا تھا۔

''عباس۔'' اور اس نام کے ساتھ ہی مجھے اپنے وجود میں انگارے بھرنے لگے تھے، آخر کار میرے مراد کا کون سا قصور تھا کہ وہ یہ جگہ نہیں لے سکا۔

میں نے آنکھیں موند لیں۔ اکیس برس پہلے کی اس طوفانی رات کا منظر پھر میری آنکھوں میں ابھر آیا۔ سفید کمبل میں لپٹا ہوا میرا سرخ و سفید بیٹا رو رہا تھا۔

میرے کانوں میں اس کی آواز
سیپی میں بند موتی کی طرح محفوظ تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم آنٹی سے اتنے فاصلے پر کیوں رہنا چاہتے ہو؟'' کھڑکی کے باہر سے تانیا کی آواز آئی اور میں اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ ''مجھے تم دونوں کے درمیان بالکل کسی سرد جنگ کی سی کیفیت لگتی ہے آخر بات کیا ہے؟''

''اس سرد جنگ کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا۔'' عباس اس سے کہہ رہا تھا۔

''یعنی تم مانتے ہو کہ تم دونوں پوری تندہی سے اس سرد جنگ میں مصروف ہو؟''

''نوے فیصد پسندیدگی اور ناپسندیدگی Reciprocal ہوتی ہے۔''

''یعنی کہ تم.....''

''یعنی کہ کچھ نہیں۔'' اس نے تانیا کی بات کاٹی۔ ''میں نے نوے فیصد کہا ہے ان کی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود میں انہیں ناپسند نہیں کرتا۔''

''پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ تمہیں بھلا کیوں ناپسند کرنے لگیں؟''

''اس کا جواب تو تمہیں وہی دے سکیں گی مجھے کیا معلوم۔'' وہ بولا۔ ''اور پلیز اب یہ نہ کہنا کہ وہ مجھے ناپسند نہیں کرتیں کیونکہ میں تمہاری یہ بات ہرگز نہیں مانوں گا۔''

''تم آنٹی کے متعلق ہی فتوے صادر کرتے رہو گے تم بتاؤ کہ تم نے پہلے ہی دن آنٹی سے ملتے ہوئے ذرا بھی گرم جوشی یا خوشی کا اظہار کیوں نہیں کیا تھا؟''

''تم جانتی ہو کہ یہ میری عادت نہیں ہے مجھے پہلی ہی ملاقات پر کسی سے رسماً یہ کہہ دینا بالکل پسند نہیں ہے کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے کیونکہ مجھے کسی سے پہلی مرتبہ مل کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوتی بلکہ اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک میں اس شخص کے اندر اتر کر یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ واقعی اتنا اچھا ہے کہ اسے پسند کیا جائے۔''

''تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو کہ تم کسی شخص کو بالکل ٹھیک طریقے سے پرکھ سکتے ہو؟'' تانیا جرح پر اتر آئی۔

''مجھے رویوں کی پہچان بہت بچپن سے ہو گئی تھی جب......'' اس نے کچھ کہتے کہتے بہت ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ایک لیڈنگ انڈسٹریلسٹ کی ناز و نعم میں پلی ہوئی اولاد جس کے بے حد وسیع گھر کی چار دیواری بے حد مضبوط ہے۔ مجھے بتاؤ کہ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے نے بچپن میں رویوں کی پہچان کیسے کی؟''

چند ثانیے خاموشی چھائی رہی پھر عباس کی آواز آئی۔ ''میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔ بہت سے سوال ایسے ہیں جن کے جواب مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے ان سوالوں کو خود پر مسلط نہیں کیا کیونکہ میں اب کسی گورکھ دھندے میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ میں صرف ممی اور بابا سے محبت کرتا ہوں سمندر کی گہرائیوں سے بھی زیادہ محبت۔ جتنی کورڈیلیا نے اپنے باپ کنگ لیئر سے کی تھی اس سے بھی زیادہ۔''

''ہوں۔'' تانیا کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔ ''اور اتنی محبتیں انہیں دینے کے بعد تمہارے پاس میرے لئے تو کچھ نہیں بچا ہو گا۔''

عباس ہولے سے ہنس پڑا۔ ''یہ کیسے سوچا تم نے، تم تو میری زندگی ہو۔''

راکنگ چیئر کی ہتھی پر میری گرفت سخت ہو گئی۔

''کیسی زندگی؟ بات تو تم میری مانتے نہیں ہو۔''

''تمہاری فرمائشیں بہت بونگی ہوتی ہیں۔''

''بونگی ہوتی ہیں؟'' مجھے یقین تھا یہ بات کہتے ہوئے تانیا نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں نکالی ہوں گی۔

''تو اور کیا؟'' عباس ہنسا۔ ''لیکن پھر بھی کہو۔ تمہارے لئے تو میں آگ کے سمندر سے بھی گزر سکتا ہوں۔''

''لیکن میرے ساتھ آنٹی کے پاس جاتے ہوئے تمہارے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔''

''او مائی گاڈ تمہارے پاس اپنی آنٹی کے علاوہ کوئی موضوع نہیں ہے، گھوم کر وہیں پہنچتی ہو۔''

''اگر تمہیں اپنی ممی سے محبت ہو سکتی ہے تو مجھے بھی اپنی آنٹی سے ہے اور میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ تم ابھی میرے ساتھ ان کے پاس چلو گے۔''

کچھ ہی لمحوں بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے بادلِ ناخواستہ اٹھ کر جانا پڑا، دروازے پر حسب توقع وہی دونوں تھے۔

''آنٹی آپ اتنی جلدی چلی آئیں ضرور بور ہوئی ہوں گی۔'' تانیا فلور کشن پر بیٹھ گئی جبکہ عباس دروازے کے قریب والے صوفے پر ٹک گیا۔

''نہیں بوریت کا کیا سوال، میں کچھ پڑھنا چاہتی تھی اس لیے چلی آئی۔''

''اوہو پھر تو ہم نے آپ کو تنگ کیا۔''

''بالکل نہیں تم مجھے کبھی تنگ نہیں کرتیں۔''

''میں اور عباس واک کر رہے تھے یہیں باغ میں، سوچا کہ کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھا جائے۔''

''ہوں بہت اچھا کیا آ گئے۔ اب امریکن سسٹم کرو۔ سیلف ہیلپ (اپنی مدد آپ) کا۔ فریج میں جوس بھی ہے، سوفٹ ڈرنکس بھی موجود ہیں جو اچھا لگے نکال لو۔''

تانیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تم کیا لو گے عباس؟''

''میرا کچھ پینے کا موڈ نہیں ہے۔''

''تانیا اسے پیپسی نکال دو اس میں نمک نہیں پڑتا۔'' میں نے راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے کہا۔

تانیا نے شاکی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولے بغیر کچن میں چلی گئی۔ میں نے عباس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں کوئی بات مچل رہی تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی آنکھیں سپاٹ ہو گئیں، برف کی طرح ٹھنڈی ٹھار۔ وہ کچھ بولا نہیں اور تانیا کے آنے پر اس نے پیپسی کا گلاس تھام لیا۔ وہ ایک گلاس مجھے دے کر اور ایک خود تھام کر واپس فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

''آنٹی آپ جنید صاحب کو جانتی ہیں؟'' تانیا نے جب دیکھا کہ خاموشی کی چادر دبیز ہوتی جارہی ہے تو اس نے ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لئے کہا۔

''ہاں جنید میرا کلاس فیلو تھا۔''

''کلاس فیلو؟'' وہ کسی قدر حیران ہو گئی۔

''ہاں اور کامریڈ ظہیر کی طرح اس کے صبح و شام بھی انقلاب کے لئے وقف تھے۔ مارکسزم اور لینن ازم سے میرا تعارف اسی کے ذریعے ہوا تھا، ان دنوں یہ لفظ ہم سب کو بہت سنسنی آمیز مسرت دیتا تھا۔ پروٹسٹ مارچ آنسو گیس اور لاٹھی چارج جیسی چیزوں سے عجیب و غریب سا رومانس وابستہ تھا لیکن میرا ان چیزوں سے عملی طور پر کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہنگامے ہمارے زمانے میں بھی ہوتے تھے، خنجر اور چاقو میز پر گاڑ کر امتحان پاس کرنے کی روایت بھی تھی لیکن اس وقت سائیکلک ریٹ پر کلاشنکوف نہیں چلا کرتی تھی۔ بہت ہو گیا تو شیشے ٹوٹتے تھے یا خالی بوتلیں توڑی جاتی تھیں۔ زیادہ تر کام ڈرامے سے ہی نکل جاتا تھا۔

''میری ماں جی کو ہر وقت میری فکر رہتی تھی، ہنگاموں کے دنوں میں مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی جبکہ جنید ان سب حرکتوں میں نمبر ایک تھا۔ لائبریری میں بیٹھ کر اس کے منہ سے یہ قصے سننا بہت اچھا لگتا تھا۔''

تانیا ہنس پڑی۔ ''لیکن انہیں دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ کامریڈ کی طرح وہ بھی کارل مارکس کے شجرے سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''یہی ہوتا تھا یہی ہوتا ہے۔ ایک حد تک آئیڈیلزم اچھی چیز ہوتی ہے لیکن اچھا ہوا کہ جنید اس آئیڈیلزم کے چکر میں نہیں پڑا رہا۔ اچھا ہوتا ہے اگر انسان حقیقت کو بلا حیل و حجت قبول کر لے۔''

''حقیقتوں سے فرار نہیں حاصل کرنا چاہئے، لیکن انہیں قبول کرنا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔'' عباس ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس سے آہستہ آہستہ کھیل رہا تھا۔

''دوا کڑوی ہی سہی لیکن بیماری سے بچا لیتی ہے۔ کڑواہٹ کے ڈر سے اسے چھوڑ نہیں دینا چاہئے ورنہ بیماری کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی جاتی ہے۔''

''میڈم انسان روبوٹ نہیں ہوتا جس میں اپنی مرضی سے ڈیٹا فیڈ کر کے اس کے لئے کوئی خاص راستہ چن دیا جائے۔ حقیقت کو قبول کرنے کے لئے بھی بار بار اس کی جگالی کرنا بھی حماقت ہے۔ کچھ حقیقتوں کو بھول جانا انہیں یاد رکھنے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔'' پھر وہ گھڑی میں دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ممی بابا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''چلو۔'' تانیا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیوقوف لڑکا۔'' اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔ ''اس کا خیال ہے کہ حقیقتوں کی جگالی انسان اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ جان بوجھ کر خود کو دکھوں کی آگ میں ڈالتا ہے۔ ہونہہ اسے کیا پتا کہ کبھی کبھار سسکیاں، چیخیں اور قہقہے آپ ہی آپ اپنے حصار میں لے لیتے ہیں اور کبھی مدد کی طالب وہ ننھی سی آواز ہر دیوار سے خود ہی نکلتی ہے۔ امیر گھرانے کا ناز و نعم میں پلا ہوا بیٹا یہ سب جان بھی کیسے سکتا ہے۔''

میری دماغی رو پھر ظفر شاہ کی طرف چلی گئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ اچھا ہی ہوا کیونکہ اب مجھ میں دوبارہ راہِ فرار اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔

میں اٹھ کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔

واقعی وہ مجھے کیسے پہچان سکتا تھا، میں نے سوچا۔ اس نے تو پندرہ سال کی ایک لڑکی کو دیکھا تھا جو معمولی سے کاٹن کے کپڑوں میں ملبوس بڑی سی سفید چادر میں لپٹی رہتی تھی اور اس چادر سے اس کی دو آنکھوں سے اوپر اور دو ہونٹوں سے نیچے سب کچھ چھپا رہتا تھا۔ آئینے میں نظر آنے والی یہ عورت اس زرد لڑکی سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اس کا سراپا کسی بھی طرح

چھتیس سینتیس برس کی عورت والا نہیں لگتا۔ بہت ہو گیا تب بھی صرف تیس برس تک کا خیال آتا ہے، لمبے خوبصورت بال، تیکھے نقوش اور چہرے پر شادابی، واقعی وہ کیسے پہچان سکتا تھا۔

میں واپس راکنگ چیئر پر آ بیٹھی۔ شاید میں بھی خود کو نہ پہچان سکوں، نین نقش ہی نہیں اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ ماضی سے پیچھا چھڑاتے ہوئے میں نے بہت سی چیزوں کو چھوڑ دیا تھا۔ کسی زمانے میں گاڑی چلانا بھی گناہِ عظیم لگتا تھا، وقت اور حالات انسان کے سراپے کو ہی نہیں سوچ کو بھی بدل دیتے ہیں۔ اب کہاں وہ چادر میں لپٹی زرد سی لڑکی۔

میرے خیالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا اور میری سوچ تانیا اور عباس کی سمت چل پڑی۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ اظہار کے مرحلے سے آگے نکل چکے ہیں۔ تانیا تو بہت معصوم ہے وہ مردوں کے ان حربوں کو نہیں جانتی۔ میں اسے منہ کے بل گرتا نہیں دیکھ سکتی، میں بیوقوفی میں اپنا آپ کھو بیٹھی تھی۔ وہ خود کو کہیں عشق کے پاگل پن کی نذر نہ کر دے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ بھی میری طرح ساری زندگی سلگتی رہے۔ نہ بجھے نہ جلے لیکن اسے پیچھے ہٹانا بھی تو آسان نہیں ہے۔

صبح میں یونیورسٹی جانے کے لئے کار کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ تانیا آ گئی۔

''آنٹی مجھے بھی ساتھ لے جائیں گی؟''

''کیوں نہیں تمہیں تو یوں بھی میرے ساتھ ہی آنا جانا چاہئے۔''

''آنٹی اپنی گاڑی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ کیا ہوا جو میرے پاس وہ رکشا نما آلٹو ہے، ہے تو میری اپنی کار۔'' وہ ہنسی۔

''ایسی کار کا کیا فائدہ کہ ہارن پہ ہارن دیتے جاؤ اور کوئی رکشے والا بھی راستہ دینے پر تیار نہ ہو۔''

''آپ ڈیڈی سے سفارش کر دیں ناں کہ وہ مجھے دوسری کار لے دیں۔'' وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

''ایم اے تک یہی چلاؤ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔'' میں نے گاڑی سٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن انجن ہلکے سے کھانس کر خاموش ہو گیا۔

''یہ کیا؟''

''پتا نہیں۔'' میں نیچے اتری اور بونٹ کھول دیا۔

''ٹھہریں میں ڈرائیور کو بلاتی ہوں۔'' تانیا سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلی گئی۔ وہ کچھ دیر تک انجن میں مختلف چیزوں کو دیکھتا رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔

''بیٹری ختم ہو رہی ہے ری چارج کروانی پڑے گی۔''

''ابھی مجھے یونیورسٹی سے دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ''کسی سے کہو دھکا لگا دے۔''

''آنٹی ڈیڈی کی کار لے جاتے ہیں۔'' تانیا نے مشورہ دیا۔

''نہیں انہیں خود بھی ضرورت پڑتی ہے وہ کیا کریں گے۔''

''اور میری گاڑی ٹیوننگ کے لئے جانی ہے۔'' وہ بولی۔

''ابھی دھکا لگ جائے گا مسئلہ کیا ہے؟''

''اور واپسی؟''

''تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' میں نے کہا۔

دھکا لگنے سے گاڑی سٹارٹ ہو گئی اور ہم یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔

''کتنے دن سے سوچ رہی تھی کہ ٹیوننگ کرا لوں گاڑی کی۔'' تانیا نے کہا۔ ''آج موقع اچھا تھا ندرت کی سالگرہ ہے اور اس کا ڈرائیور ایک بجے تک آ کر لے جائے گا ہمیں۔ ڈراپ بھی وہی کرے گی گھر پر میں نے سوچا کہ صبح آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے نیو کیمپس پہنچ گئے سامنے ہی ندرت کھڑی تھی۔

''سالگرہ مبارک۔'' میں نے اس سے کہا۔

''تھینک یو۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''کیک کب کھلاؤ گی؟''

''آج ہی جب آپ کے پاس چائے پینے آئیں گے تب۔''

''یعنی آج بھی چائے میرے ذمے؟''

''میڈم چائے آپ کے ذمے ہی رہے گی۔'' وہ ہنسی۔

اور پھر گیارہ بجے کے قریب انہوں نے میرے آفس پر دھاوا بول دیا۔

''میڈم کیک آ گیا ہے۔'' ندرت بولی ''اب آپ چائے منگوائیں۔''

جواد نے کیک کا ڈبہ اور برگرز میری میز پر رکھ دیئے۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور ندرت نے ہیپی برتھ ڈے کے شور میں کیک کاٹا۔

''ویسے ندرت میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا کیک کا تم سچ مچ لے آئیں۔'' میں نے کہا۔

''میڈم یہ کیک تو عباس کی طرف سے ہے۔'' وہ بولی۔

میرا کیک کی طرف اٹھتا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس کی جگہ میں نے برگر اٹھا لیا۔

''سالگرہ تمہاری تھی کیک بھی تمہاری طرف سے ہونا چاہئے تھا۔''

''لیکن میڈم آپ نے تو لیا ہی نہیں۔''

''میں ڈائٹ پر ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ؟ آپ کو کیا ضرورت ہے ڈائٹ کی؟'' کامریڈ حیرت سے بولا۔

''جی میڈم کامریڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' صبا نے کہا۔

میں ہنس پڑی۔

''اور آنٹی آپ کی گاڑی کا اللہ ہی حافظ ہے۔'' تانیا بولی۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''اس نے چلنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔''

میں نے تانیا کو گاڑی کی ڈپلیکیٹ چابی دے رکھی تھی۔

''ہمیں ابھی بیکرز ان جانا تھا کیک لانے کے لئے۔'' تانیا کہہ رہی تھی۔ ''میں نے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن صبح تو اس نے کچھ نہ کچھ کھانسا تھا اب تو غاؤں تک نہیں کیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس کی بیماری میرے خیال سے زیادہ بڑی نکلی۔'' میں بولی۔

''اب واپسی پر مسئلہ ہوگا۔''

''مسئلہ کوئی نہیں ہوگا میڈم میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔'' عباس نے پیشکش کی۔

''تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس سے بات کرتے ہوئے میرا لہجہ خود بخود ہی سخت ہو گیا تھا۔

''اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔'' تانیا جلدی سے بولی۔ ''عباس آسانی سے آپ کو ڈراپ کر سکتا ہے۔''

''میں نے کہا ناں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

میرے لہجے کو محسوس کر کے پھر کسی نے یہ بات نہیں کی۔ تانیا کا موڈ مجھے آف لگ رہا تھا اور عباس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

بارہ بجے کے قریب میں نے جواد سے رکشا منگوایا اور گھر آ گئی۔

عباس کا سپاٹ چہرہ مجھے یہ بتا دینے کے لئے کافی تھا کہ میری نفرت کا پیغام اس تک پہنچ گیا ہے۔ وہ امیر شاہ کا بیٹا تھا اور ہو بہو اس کی تصویر تھا۔ اسے تکلیف میں دیکھ کر طمانیت میرے رگ و پے میں دوڑتی جاتی تھی۔ عباس کا سپاٹ چہرہ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ اپنی تکلیف اور اس توہین کو چھپا رہا تھا جس میں میرے انکار نے اسے مبتلا کیا تھا۔

وہ دن بھی خاصا مصروف تھا۔ پہلے فائنل اور پھر پریویس کی کلاس تھی۔ اس کے بعد میں نے آرٹیکل لکھنا تھا اور ابھی آرٹیکل ادھورا ہی تھا کہ ٹوریل کا وقت ہوگا۔ خیر ٹوریل تو بہانہ ہی تھا، تانیا اور اس کے دوستوں کو مجھ سے چائے پینے میں مزہ آتا تھا اس لیے وقت بے وقت یوں بھی چلے آتے تھے۔

''آنٹی آپ کچھ مصروف لگ رہی ہیں۔'' تانیا نے ٹائپ رائٹر میرے سامنے پڑا دیکھا تو بولی۔

''ہاں ایک آرٹیکل لکھ رہی تھی۔''

''میڈم پہلے چائے پلائیں پھر کلاس ہوگی۔'' جنید نے آتے ساتھ ہی مطالبہ داغ دیا۔

میں نے گھنٹی بجا کر بابا دینا کو چائے لانے کے لئے کہا پھر ان سے مخاطب ہوئی۔ ''آج آپ کے پاس ٹاپک ہے یا میں کوئی گیند آپ کے کورٹ میں پھینکوں۔''

''میڈم ٹاپک چھوڑیں پہلے میرا ایک مسئلہ حل کرنے میں میری مدد کریں۔'' کامریڈ ظہیر نے کہا۔

''تم ہمیشہ مسائل کا شکار کیوں رہتے ہو کامریڈ؟'' میں نے دلچسپی سے اس کی جانب دیکھا۔

''سوویت یونین کی طرح۔'' ندرت نے ٹکڑا لگایا۔

''چپ، کامریڈ ظہیر مرحوم ومغفور کے متعلق کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔'' جواد نے تنبیہہ کی۔

''میڈم آپ دیکھ رہی ہیں کہ یہ امریکہ کی طرح مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''چھوٹی قوموں کو بڑی طاقتوں کی اشتعال انگیزی کے جواب میں مشتعل ہونا خاصا مہنگا پڑتا ہے۔'' ندرت ہنسی۔

''تم لوگ بھی مجاہدی صاحب سے کچھ کم تو نہیں ہو۔'' صبا نے اپنے بھورے بالوں کے پیچھے سے جھانکا۔ ''ہر وقت اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔''

''تمہیں کیوں اتنی ہمدردی ہو رہی ہے اس سے؟'' تانیا نے اسے گھورا۔

''اس مسکین کی شکل تو دیکھو، اس عاجزی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ مگر تم لوگ اس کی عاجزی اور مسکینی کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔'' صبا کے لہجے میں شرارت تھی۔

''بیٹھو یہ سب زیادتی آپ کی موجودگی میں ہو رہی ہے اور آپ اقوام متحدہ کی طرح خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں۔ ظلم کے ضابطے ہم نہیں مانتے۔ میں اس شر انگیز پروپیگنڈا کے خلاف احتجاجاً علامتی واک آؤٹ کرنے لگا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''اور اب یہ بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟''

''جب تک یہ لوگ اپنی زبانیں بند نہیں کریں گے تب تک میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''آل رائٹ بچو اب کامریڈ کے علاوہ کوئی نہیں بولے گا۔'' میں نے حکم جاری کیا۔

''میڈم میرے ڈیڈ کا حکم ہے کہ اس مرتبہ مجھے سول سروس کے امتحان میں بیٹھنا ہے۔''

''پھر؟''

''آپ کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' وہ حیرت سے بولا۔ ''یعنی میں بیوروکریٹ بن گیا تو کچھ فرق ہی نہیں پڑے گا۔ کچھ تو سوچیں میڈم، میں جی او آر میں پہنچ گیا تو انقلاب کا کیا بنے گا؟''

''وہی جو اب بن رہا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ویسے تمہیں فکر کرنے کی

ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم امتحان میں بیٹھ بھی گئے تو پاس نہیں ہو گے۔''

میری بات پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے میرے لئے صرف امتحان میں بیٹھنا ضروری ہے پرچا کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر میں پوری آنسر شیٹ خالی چھوڑ آیا تب بھی میری سیٹ ڈی ایم جی میں کنفرم ہو چکی ہے۔'' اس کا پھٹے ہوئے جاگر میں بند پاؤں تیزی سے حرکت کرنے لگا۔

''ڈیڈ جیسے سینئر بیوروکریٹ کو اوبلائج کرنے کا موقع کوئی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔''

''ہوں یہ تو واقعی گھمبیر مسئلہ ہے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ سول سروس میں نہیں جاؤ گے تب بھی کچھ تو کرو گے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اس ملک میں مارکسزم کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں۔''

''تاکہ انقلاب کی چکی میں پیس کر اس کے آٹے کی روٹیاں بھی کھاؤ اور سارے ملک میں تقسیم بھی کر سکو۔'' میں بولی۔

''آپ کچھ بھی کہہ لیں شروع میں ہر بڑے آدمی کا یونہی مذاق بنتا ہے۔''

''تمہارے مسئلے کا ایک آسان حل ہے میرے پاس۔''

''کیا میڈم؟''

''تم اپنے ڈیڈ سے کچھ مہلت لے لو مثلاً فائنل امتحان تک۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''تمہیں عقل آ جائے گی، تمہارا انقلاب تہہ میں بیٹھ جائے گا اور تم سنجیدگی سے سول سروس کے امتحان کی تیاری شروع کر دو گے۔''

''یہ دنیا بڑے لوگوں کو یونہی ستاتی ہے۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

''میڈم آپ نے سول سروس کا امتحان کیوں نہیں دیا؟'' جواد نے پوچھا۔ ''جس لائن میں آپ ہیں یہاں تک تو سب بہت تھک ہار کر پہنچتے ہیں۔ جب کہیں اور دال نہیں گلتی تو آخری چوائس کے طور پر ٹیچنگ پروفیشن کو اپنایا جاتا ہے۔''

''جب میں یہ سنتی ہوں تو یقین کرو ذہن کو سخت دھچکا لگتا ہے کہ اتنے معزز پیشے کا یہ حال بنا دیا گیا ہے۔ بہرحال ایسا ہو رہا ہے اس لئے تمہاری بات کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن میرے

مسئلے کچھ اور تھے۔'' میں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں اور ذہن کو یکسو کیا۔'' میرے والد صاحب چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں ایم بی بی ایس ڈاکٹر لیکن ان کی وفات کے بعد حالات کچھ ایسے تھے کہ مجھے گھر پر ہی پڑھنا پڑتا اس لئے ایف ایس سی تو نہیں کیا جا سکا۔ ماسٹرز البتہ میں نے یونیورسٹی سے ہی کیا تھا، تب مجھ پر دھن سوار ہو گئی تھی کہ میں نے ڈاکٹریٹ کرنا ہے۔ اس طرح نہیں تو اس طرح میرے ابا جی کی خواہش پوری ہو جائے گی۔

مجھے اس کالرشپ ملا میں سوچ رہی تھی کہ امریکہ جاؤں یا نہ جاؤں کیونکہ میرے جانے کی صورت میں ماں جی تنہا رہ جاتیں لیکن یہ فیصلہ میرے بجائے انہوں نے خود ہی کر لیا۔ اسی رات وہ سوتے میں انتقال کر گئی تھیں، پھر میرا پیچھے کون تھا جس کے لئے رکتی سو میں چلی گئی۔''

''اور پھر اب واپس آئیں۔'' ندرت مجھے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔'' آپ کو یاد نہیں آئی وطن کی، اتنا عرصہ کیوں دور رہیں؟''

''کیونکہ.....'' میری نظریں خود بخود عباس کی طرف اٹھ گئیں۔

کج اونج وی راواں اوکھیاں سن
کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوگ وی ظالم سن
کج مینوں مرن دا شوق وی سی

''اگر ایسا تھا تو پھر آنے کی ہمت کیسے بندھی؟'' صبا بولی۔

''مجھے کسی چیز کی تلاش واپس لے آئی ہے کیونکہ:

''سنا ہے گمشدہ چیزیں
جہاں پہ کھوئی جاتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں''

''پھر آپ کو ملی وہ چیز؟'' تانیا کی آنکھوں میں کسی قدر حیرت تھی، اپنی دانست میں وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔

''میں نے ڈھونڈھی ہی نہیں، ابھی تک میں ہمت مجتمع کر رہی ہوں کیونکہ اگر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی تو یہ جو آس اور امید ہے یہ بھی ختم ہو جائے گی اور میں اسے ختم ہونے نہیں دینا

چاہتی۔''

''آنٹی آپ کو کس چیز کی تلاش واپس لائی ہے؟''

''آج مجھے تم لوگوں کا موڈ پڑھنے کا نہیں لگ رہا۔'' میں نے جان بوجھ کر تانیا کی بات نظر انداز کر دی۔

''بالکل درست سمجھا آپ نے۔'' جواد بولا۔ وہ سب سمجھ گئے کہ میں مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔

''میڈم آپ آج کل بھی کسی چیز پر ریسرچ کر رہی ہیں؟'' صبا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔''میں آج کل پاکستان میں زنا بالجبر کے موضوع پر تحقیق کر رہی ہوں۔'' میری نظریں ایک بار پھر خود بخود عباس کی طرف اٹھ گئیں جو سر جھکائے اپنی فائل پر پنسل سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

''کیا آپ کے خیال میں ہمارے ملک میں یہ مسئلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس پر تحقیق کی نوبت آ جائے۔'' صبا نے پوچھا۔

''مسئلہ تو یہ شروع سے تھا لیکن پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں اس کی شدت کو بہت تاخیر سے محسوس کیا گیا ہے۔'' میں نے انہیں بتانا شروع کیا۔''پھر یہ بھی ہے کہ اس مسئلے کو ہمیشہ سوشل ٹیب سمجھا گیا ہے اور ہمارے جیسے معاشرے میں جہاں مذہب کے پرچار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن اس کی گہرائی میں جانے کے بجائے ہم سب اس کی سطح پر ہی ہچکولے کھا رہے ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق سوچنا بھی برائی تصور کیا جاتا ہے، میں اسے اس معاشرے کی بدقسمتی سمجھتی ہوں کہ ہم نے اپنے دین فطرت کو چند Ritulas تک محدود کر دیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم ان باتوں پر سوچتے اور ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے لیکن ہم نے یہ طے کیا کہ معاشرے کے تمام گند کو قالین کے نیچے پھینکتے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساری گندگی ہماری نظروں سے اوجھل گئی اور اس دوران اتنی پھل پھول گئی کہ اب یہ اس بوسیدہ قالین کو چاٹ چاٹ کر ختم کر رہی ہے اور پوری شدت کے ساتھ اوپر آنے کے لئے زور لگا رہی ہے۔''

''میرے خیال سے میڈم ہمارے ہی نہیں یہ تو ہر معاشرے میں سوشل عیب سمجھا جاتا

ہے۔'' جواد بولا۔

''ہاں اس میں شک نہیں کہ ایسا ہی ہے لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس ٹیب سے نکل رہے ہیں اور اسے مسئلہ سمجھتے ہوئے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس مسئلے کو ستر کی دہائی میں امریکہ میں اٹھایا گیا۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کے متعلق مضمون شائع ہوئے۔ پھر 1974ء میں نیویارک کی عورتوں کی ایک تنظیم نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی شائع کی لیکن درحقیقت جس کتاب نے سب کو اس مسئلے پر سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ 1975ء میں نیویارک ہی میں چھپنے والی کتاب Against Our Will تھی اور اسی کتاب کی وجہ سے لوگوں کی توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ میں اس پر بہت کام ہوا اور بہت سی پرانی سوچیں دم توڑنے لگیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صرف فیشن شدہ لڑکیاں اس کا شکار ہوتی ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اس بنیادی غلط فہمی کا ہی نتیجہ ہے کہ الزام مجرم کے سر جانے کے بجائے ظلم کا شکار ہونے والی عورت کے سر منڈھ دیا جاتا ہے، یہ فائل ہے میرے پاس۔'' میں نے سامنے میز پر رکھی ہوئی فائل ان کے سامنے سرکائی۔ ''جس میں ملک میں شائع ہونے والے تقریباً سبھی اردو اور انگریزی اخباروں کے تراشے موجود تھے، ان تراشوں کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ یہ سوچ سراسر غلط ہے۔''

''یہ کیس محمود بوٹی لاہور میں ہوا تھا۔'' میں نے ایک تراشا ان کے سامنے رکھ دیا۔ ''اس کیس میں جن عورتوں کے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک کیا گیا ان کی عمریں سولہ سے ساٹھ سال تک تھیں اور وہ مزدور عورتیں تھیں۔ پھر یہ ساہیوال کی فضیہ کے متعلق خبر ہے جو گھریلو ملازمہ تھی اور اندھی بھی تھی۔ یہ خبر انور بی بی اور فاطمہ بی بی کے متعلق ہے جن کا تعلق ایک بھٹہ مزدور کے گھرانے سے تھا۔ انہیں پولیس نے اس ظلم کا نشانہ بنایا، انہوں نے کسی طرح بھی مجرموں کو جرم پر اکسایا نہیں تھا۔''

سب خاموشی سے میری بات سن رہے تھے۔

''یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو عورتیں پردہ کرتی ہیں اور اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند ہوتی ہیں وہ اس جرم کا نشانہ نہیں بنتیں۔ یہ خیال بھی سراسر غلط ہے، آج کل بہت سے شہروں میں صورت حال یہ ہے کہ ڈاکو گھر کی دیوار پھاند کر اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور

ایسے لوگوں کے نزدیک پردے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہماری پولیس بھی بعض اوقات اسی طرح گھروں میں زبردستی گھستی ہے اور اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ خاندان کے کسی مرد کو برآمد کرنے کے لئے اس گھرانے کی عورتیں تھانے لے جائی جاتی ہیں اور وہاں قانون کے محافظ قانون اور اخلاقیات کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔

''ایک اور بہت غلط خیال یہ بھی ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے مرد نارمل انسان نہیں ہوتے۔ اگر تحقیق کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایسا صرف چند کیسوں میں ہوتا ہے، ایسے مجرم کو ایب نارمل قرار دے کر ہم گویا اسے جرم کے ارتکاب کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔

پاکستان میں اس جرم کی نوعیت مختلف علاقوں میں مختلف ہے اور یہاں اس کی وجوہات کا جائزہ لینے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم عورت کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ عورت کو خاندان کا سربراہ سمجھا جاتا تھا لیکن پھر معاشرے میں تبدیلیاں آئیں۔ معاشی بھی اور سماجی بھی اور انہی تبدیلیوں نے نظریات تبدیل کر دیئے۔ مرد خاندان کا سربراہ بن گیا اور دولت، زمین اور عورت ان تینوں چیزوں کو اس کی ملکیت سمجھا جانے لگا۔ دنیا کے بیشتر علاقوں میں آج بھی یہی مقبولِ عام نظریہ ہے۔ صرف افریقہ کے چند علاقے ہیں اور انڈیا کے دور دراز مقامات جہاں یہ نظریات اب تک نہیں اپنائے گئے لیکن ایسے علاقے بہت کم ہیں۔

ملکیت کا یہ تصور ہمارے معاشرے میں بھی رائج ہے اور عورت کی حیثیت اوبجکیٹ کی سی ہے۔ زن، زر اور زمین کا فلسفہ اسی حیثیت کی پیداوار ہے، ابھی پچھلے دنوں مجھے ایک ٹی وی ڈرامے کی ویڈیو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ شاید آپ میں سے بھی کسی نے دیکھا ہو۔''

''میڈم کون سا ڈرامہ؟''

''دیواریں۔ جس میں ایک شخص کی گھوڑی چرائی جاتی ہے اور بدلے میں وہ شخص دوسرے خاندان کی لڑکی اغوا کر لاتا ہے۔''

''جی دیکھا ہوا ہے۔'' ان میں سے بیشتر نے ڈرامہ دیکھ رکھا تھا۔

''اس سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے دیہی علاقوں میں زن، زر اور زمین کو ایک جیسی حیثیت دی جاتی ہے اور ان علاقوں میں کسی سے بدلہ لینا ہو تو مخالف گھرانے کی لڑکی اغوا کر لی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس خاندان کی لڑکی اغوا ہوئی ہوتی ہے وہ انتقاماً دوسرے خاندان کی لڑکی اغوا کرلاتے ہیں۔ اس نوع کے عجیب وغریب اور خود ساختہ قانون انصاف میں دونوں طرف مصیبت کا شکار لڑکی ہی ہوتی ہے۔

لیکن شہروں میں صورتِ حال مختلف ہے، اس جرم کو ہم تین بنیادی خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس کا ارتکاب عموماً غصے میں طاقت کو استعمال کر کے اور کسی نفسیاتی بیماری کے زیر اثر رہتے ہوئے کیا جاتا ہے۔''

''اصل میں میڈم پورے ملک میں تشدد کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔'' ندرت بولی۔ ''لوگوں کے پاس کوئی آؤٹ لٹ نہیں رہی اپنی فرسٹریشن کو باہر نکالنے کی۔''

''ایک حد تک یہ بات بھی درست ہے لیکن اگر اجتماعی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو صرف یہ فرسٹریشن کا کیس نہیں ہے۔'' پھر میں نے اپنی دراز کھولی اور چند لفافے باہر نکالے۔ ''یہ خطوط مجھے مختلف انجمنوں کی جانب سے ملے ہیں، کراچی میں ان مظلوم عورتوں کو سہارا دینے کے لئے بہت سے سینٹرز ہیں۔ اب کچھ تنظیمیں ایسی ہیں جو یہاں لاہور میں بھی کونسلنگ سینٹرز قائم کرنا چاہتی ہیں کیونکہ یہ مسئلہ صرف عورتوں کا نہیں ہے یہ تہذیبِ انسانی کا مسئلہ ہے۔''

''کیا آپ کے خیال میں اس جرم کا شکار ہونے والی عورت کو یہ بتا دینا چاہئے کہ وہ اس کا شکار ہوئی ہے؟'' تانیا نے پوچھا۔

میں چند ثانیے کے لئے سوچ میں ڈوب گئی۔ جب میں انیس شاہ کے پاس گئی تھی تو اتنی کم عمر تھی کہ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ چیخ پڑنے سے مجھے کون سی چیز باز رکھ سکتی ہے جبکہ میرا سب کچھ تو پہلے ہی کھو گیا ہے اور مزید کچھ کھونے کے لئے میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ بعد کے برسوں میں مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اس کے پاس آخر چلی کیسے گئی تھی۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ بے شک کھو گیا تھا لیکن بدنامی کا حلقہ محدود تھا، میرے ہر طرف چیختے پھرنے سے مجھے کیا مل جاتا سوائے اس کے کہ کچھ مزید انگلیاں میری طرف اٹھتیں۔

لیکن جب مزید چند برس گزرنے کے بعد میں نے اس پر سوچا تو میری سوچ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو چکی تھی۔

''ہاں۔'' میں نے تانیا کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''گو کہ یہ بے حد مشکل اور کٹھن ہے لیکن یہ ہمت پیدا تو کرنی پڑے گی ورنہ یہ جرم کبھی نہیں مٹے گا۔ اس کے خلاف کوئی نہیں لڑے گا اور عورت کی پاکیزگی اور معصومیت ہمیشہ یونہی تار تار ہوتی رہے گی۔ اب سے پہلے یہ جرم بلاخوف وخطر ہوتا رہا ہے کہ عزت کے ڈر سے یوں بھی لوگ چپ ہو جائیں گے اور مجرم کو کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہوگا لیکن اب اسے کم از کم یہ احساس تو ہوگا کہ کوئی ہاتھ بھی اس کے گریبان تک پہنچ سکتا ہے۔''

''میڈم جب تک موجودہ قوانین لاگو ہیں مجرم کے گریبان تک ہاتھ پہنچانا بہت مشکل ہے۔'' عباس نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

''ایسے کسی بھی کام میں رکاوٹیں تو بہت ملتی ہیں لیکن قانون بدلنے سے پہلے معاشرے کا مزاج بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آج امریکہ میں یہ قانون نافذ ہو جائے کہ شراب نوشی نہ کی جائے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ لوگ پینا چھوڑ دیں گے؟ نہیں۔ ایسا کوئی بھی قانون نافذ کرنے سے پہلے لوگوں کا مزاج بدلنا ضروری ہوگا۔ ایسی رکاوٹوں کو وقت کے ساتھ ساتھ دور کر لیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے رائے عامہ کو ہموار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس مسئلے پر لوگ سوچنا شروع کر دیں بالآخر اس کا حل بھی ڈھونڈ لیا جاتا ہے، سوچنا شرط ہے۔'' پھر میں نے گھڑی دیکھی۔ ''اب تم لوگوں نے چائے بھی پی لی ہے اور کلاس کا وقت بھی ختم ہو رہا ہے اس لئے اب تم لوگ جاؤ، مجھے یہ آرٹیکل مکمل کرنا ہے۔''

سب اپنی اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھنے لگے۔ اسی دوران تانیا کی نگاہ عباس کی فائل پر پڑی جس پر کافی دیر سے جھکا وہ کچھ لکھ رہا تھا۔

''ہائے عباس تم نے اچھا اسکیچ بنایا ہے آنٹی کا۔'' وہ حیرت سے چلائی۔

میری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں وہ فائل بند کر کے اٹھنے لگا۔

''دکھاؤ۔'' صبا نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''کوئی خاص نہیں ہے۔'' عباس کے چہرے پر بے نیازی کی تہیں چڑھنے لگیں۔

"تم کتنے روڈ ہو عباس۔" صبا نے برا مان کر کہا۔

"یونہی بیٹھے بیٹھے لکیریں کھینچی ہیں اسے پتا نہیں کیوں لگا کہ میں نے میڈم کا اسکیچ بنایا ہے۔" وہ بولا۔

"جو بھی ہے تم دکھا دو گے تو تمہارا کیا چلا جائے گا۔" تانیا چڑ گئی، پھر اس کی فائل کھینچ کر اس نے وہ صفحہ نکال لیا۔ "یہ اُلٹی سیدھی لکیریں لگتی ہیں تمہیں؟" وہ چلائی۔ "اتنا اچھا اسکیچ ہے ویسے تمہیں انکساری سے کام لینے کی عادت تو نہیں ہے۔"

اس نے صفحہ میرے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ عباس کے علاوہ باقی سب میری میز کے گرد جمع ہو کر اسکیچ دیکھنے لگے۔ پنسل سے بنی ہوئی وہ تصویر اتنی عمدہ تھی کہ ایک لمحے کو تو میں حیران ہی رہ گئی۔

"تم نے کہیں سے سیکھا ہے تصویریں بنانا؟" میں نے نگاہ اٹھائی۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے لگتا ہے جیسے یہ سب مجھے پیدا ہوتے ہی آتا تھا۔"

نفرت کی تمام سلوٹیں میرے چہرے پر پھیل گئیں، اب اس میں کیا شک رہ گیا تھا کہ وہ انیس کا بیٹا نہیں ہے۔

"تم نے میری ہی تصویر کیوں بنائی؟" میں نے خود پر قابو پا کر پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"یونہی میں کبھی کسی خاص وجہ سے کوئی تصویر نہیں بناتا۔"

"کتنا اچھا ہو عباس کہ تم آنٹی کو یہ اسکیچ گفٹ کر دو۔" تانیا بولی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس طرح ہم دونوں کے درمیان تعلقات بہتر ہونے لگیں گے۔

عباس ایک قدم آگے بڑھا، اسکیچ والا کاغذ اپنے قریب سرکایا اور قمیص میں اٹکا ہوا شیفر بال پوائنٹ نکال کر A Gift Of Love لکھ دیا۔

"یہ آپ کے لئے۔" اس نے کاغذ دوبارہ میرے سامنے رکھ دیا۔

"اچھا آنٹی اب ہم جاتے ہیں۔" تانیا بہت خوش تھی کہ اب میں اور عباس ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔

وہ ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے کاغذ اٹھایا۔ بہت پہلے کا

تاریک دن ایک بار پھر میری آنکھوں میں گھوم گیا، اس دن انیس شاہ نے میرا اسکیچ بنایا تھا اور آج اس کے بیٹے نے۔

نفرت کی ایک لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی، میں مزید ایک لمحے کو بھی انیس شاہ کے بیٹے کے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویر اپنے ہاتھوں میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اسی لمحے کاغذ پرزہ پرزہ کر دیا۔ آفس سے نکلنے والا آخری فرد عباس تھا، کاغذ پھٹنے کی چرچراہٹ سن کر اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں تکلیف اور اذیت کے آثار ابھرے اور دوسرے ہی لمحے وہ رخ موڑے باہر نکل چکا تھا۔ ان تمام پرزوں کو اٹھا کر میں نے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

عباس کی آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات نے میرے دل میں طمانیت بھر دی تھی۔ میرے لئے وہ عباس نہیں انیس شاہ تھا اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا وہ کم تھا۔ میری پوری زندگی کی تباہی کے بدلے میں یہ اذیت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک تصویر پھٹنے پر اس کی یہ حالت ہوئی تھی تو میری کتابِ حیات کا ہر ورق پرزہ پرزہ کر کے ہوا میں اڑا دینے سے میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس اذیت کا مداوا کون کر سکتا تھا جو میں نے بھگتی تھی اور اب تک بھگت رہی تھی۔ ایک ایسی سزا خوامخواہ میرا مقدر ٹھہری تھی جس کا جرم مجھ سے سرزد بھی نہیں ہوا تھا۔

اس واقعے کے بعد عباس اور میرے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے تھے۔ پہلے وہ میری کلاس سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا تھا اب اس نے آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ سب دوستوں کے ساتھ میرے آفس میں بھی چلا آتا تھا لیکن اب وہ کسی ضروری کام سے بھی وہاں نہیں آتا تھا اور تانیا حیران تھی کہ حالات بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب کیسے ہو گئے۔

اس دن میں تانیا کی فرمائش پر اسی کے گھر کے کچن میں چائنیز بنا رہی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تانیا باہر اپنی کار دھو کر ابھی ابھی اندر آئی تھی، اس نے ڈھیلی سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور جینز کے پائنچے چڑھائے ہوئے تھے۔ اپنے بالوں کی اونچی سی پونی جھلاتی ہوئی وہ میرے پاس آ گئی۔

"اس موسم میں کار دھونے کا کیا فائدہ تھا؟" میں نے کہا۔ "ابھی بارش ہو گئی تو سب

سڑکیں کیچڑ کیچڑ ہو جائیں گی۔"

"بس میرا دل چاہ رہا تھا۔" اس نے ایک دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکا۔

"ابھی کچھ نہیں پکا یوں بھی کھانے میں خاصی دیر ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تو عادت کے مطابق یونہی دیکھ رہی تھی۔" وہ ہنسی۔ "یوں بھی مجھے ڈائٹنگ کی فکر نہیں ہے کچھ کھالوں موٹی نہیں ہو سکتی۔"

"آج بندھے ہوئے بالوں میں اچھی لگ رہی ہو۔"

"باندھے تو اس لئے ہیں کہ ان کی شیپ ہی بگڑ گئی ہے آج کل میں کٹوانے کا ارادہ ہے۔" وہ بولی "عباس کہہ رہا تھا کہ میں بوائے کٹ کروالوں اچھا لگے گا۔"

بند گوبھی کاٹتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے۔ "میرا خیال ہے کہ بوائے کٹ کی بجائے اسٹیپ میں بال کٹوالو تو زیادہ بہتر لگے گا۔"

اس کا سارا جوش و خروش ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔

"ان دو کے علاوہ بھی بہت سے سٹائل ہیں وہیں کسی کتاب سے دیکھ کر ویسے ہی بال بنوا لوں گی۔"

اس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ کال بیل بج اٹھی۔

"میں دیکھتی ہوں کون ہے۔" وہ باہر نکل گئی۔

اس نے آج جمعدارنی کے علاوہ سب ملازمین کو چھٹی دے رکھی تھی اور کچن کے علاوہ سب کام بھاگ بھاگ کر خود ہی کر رہی تھی۔ کافی دیر ہو گئی اور تانیا واپس نہیں آئی تو میں اسے دیکھنے کے لئے کچن سے باہر نکل آئی۔ تانیا اپنے کمرے میں تھی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی عباس بھی اس کے ساتھ تھا۔

"بہت اچھے وقت آئے ہو۔" تانیا کہہ رہی تھی۔ "واہ واہ کیا مزے کے کھانے پک رہے ہیں آج۔"

"مزے کے کھانے کی تو تم ویسے بھی شوقین ہو اور روز پکواتی ہو آج کیا خاص بات ہے؟" یہ عباس تھا۔

"بات یہ ہے کہ آج آنٹی سے چائنیز کی فرمائش کی ہے اور تمہیں کیا بتاؤں آنٹی کتنا اچھا

کھانا پکاتی ہیں۔ کوئی کک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تم بھی کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔"

"میرا آج گھر پر ہی کھانے کا پروگرام ہے۔"

"عباس کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔" تانیا رو دینے کو تھی۔ "کچھ تو بتاؤ بات کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ "سوائے اس کے کہ آج میں نے ممی اور بابا سے وعدہ کر رکھا ہے کہ لنچ ان کے ساتھ ہی کروں گا۔"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ چڑ گئی۔ "کم از کم مجھ سے تو نہ بولا کرو۔"

"دیکھو تانیا بہت سیدھی بات ہے تمہاری آنٹی مجھے پسند نہیں کرتیں۔ پہلے دن تمہیں میری اس بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن اب تم اسے جھٹلا نہیں سکتیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایسی باتیں کی ہیں جن کا جواب میں انہیں دے سکتا تھا لیکن صرف تمہاری وجہ سے خاموش رہا کیونکہ وہ تمہاری آنٹی ہیں اور تمہیں ان سے محبت ہے لیکن ضروری نہیں کہ آئندہ بھی میں یہ بات یاد رکھ سکوں۔ اس لئے بہتر ہے کہ جس قدر ممکن ہو ان سے دور رہوں، ورنہ ہماری وجہ سے تکلیف صرف تمہیں ہو گی اور میں تمہیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"نہ آنٹی مجھے تکلیف میں دیکھ سکتی ہیں اور نہ تم پھر بھی تم دونوں مل کر مجھے کچوکے لگا رہے ہو، مجھے سمجھ نہیں آ رہی آخر ایسا کیوں ہے؟"

"اسی کیوں نے تو میرے دماغ میں بھی گرہ لگا رکھی ہے لیکن مجھے جواب نہیں ملا تمہاری آنٹی کی بیگانگی اور ناپسندیدگی کا۔ مجھے لگتا ہے کہ کہیں ایسا کوئی تعلق ہے جس کی مجھے خبر نہیں اس ڈور کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔"

"تم دونوں مجھے الجھا رہے ہو۔" وہ بولی۔

"چلو لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔" عباس شاید اس کا موڈ درست کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

"میں نے آنٹی سے لنچ کی فرمائش کی ہوئی ہے۔"

"تب تک ہم آ جائیں گے چلو جاؤ انہیں بتا آؤ۔"

عباس کی بات سن کر میں چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تانیا پردہ ہٹا کر کمرے سے نکلی تو شاید

یہ سمجھی کہ میں کچن کی طرف سے ابھی آرہی ہوں۔

''سوری آنٹی آپ تو پریشان ہوگئی ہوں گی کہ میں کہاں غائب ہوگئی ہوں۔ اصل میں عباس آیا ہے ابھی ابھی اور بیٹھے بیٹھے لانگ ڈرائیو کا پروگرام بن گیا، آپ فکر نہ کریں میں کھانے تک آجاؤں گی۔''

''باہر اتنے بادل ہیں، تھوڑی دیر میں بارش شروع ہوجائے گی۔ اتنے خراب موسم میں کون سی لانگ ڈرائیو ہوتی ہے۔''

''آنٹی عباس بہت اچھی ڈرائیونگ کرتا ہے۔'' وہ بات کر کے میری طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

واضح طور پر اسے میرا ٹوکنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں چپ چاپ کچن میں چلی آئی، باہر کار سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور چند لمحے کے بعد معدوم ہوگئی۔ میں گہری سانس لے کر ڈبے سے چاول نکالنے لگی۔

''پتا نہیں تانیا کہاں چلی گئی ہے۔'' اس کے ڈیڈی فیضان علی شاہ اسے ڈھونڈتے ہوئے کچن میں آگئے۔

''وہ عباس کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر گئی ہے۔'' میں نے چاول چنتے ہوئے کہا۔

''خود ڈرائیو پر چلی گئی ہے اور تمہیں کام پر الجھا گئی ہے۔''

''اس کے لئے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''صبح ناشتے کے وقت تو خوب دعوے کر رہی تھی کہ تمہارا ہاتھ بٹائے گی اسے اس وعدہ خلافی کی سزا ملنی چاہئے۔''

''مثلاً؟'' میں مسکرا دی۔

''مثلاً یہ کہ خانساماں کو کوارٹر سے بلا کر باقی کام اس کے سپرد کر دو۔ تانیا کو کیا معلوم ہوگا کہ کھانا کس نے پکایا ہے۔'' انہوں نے تجویز دی۔

''اونہوں' وہ فوراً پہچان جاتی ہے اور پھر میں نے بھی تو اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔''

''میں کچھ عرصے سے اب تانیا کے متعلق سوچنے لگا ہوں کہ ماسٹرز کے فوراً بعد اس کی شادی کر دی جائے۔'' انہوں نے پائپ سلگایا۔

میرے چاول چنتے ہاتھ ایک لمحے کے لئے رک گئے۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''لڑکے تو اچھے مل ہی جاتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ خاندان بھی بہت اچھا ہو۔'' پھر وہ پائپ کا کش لینے کے بعد قدرے توقف سے بولے۔ ''وہ تم سے بہت قریب ہے اس نے کبھی عباس یا کسی اور لڑکے کے متعلق تم سے کچھ کہا تو نہیں؟''

میں نے نظریں اٹھائیں۔ ''نہیں۔''

''ذاتی طور پر مجھے عباس پسند ہے اور میرا اندازہ ہے کہ ظفر شاہ اور بھابی بھی یہی چاہتے ہیں۔''

''عباس صرف اپنی ذات کے غبارے میں ہوا بھرنا جانتا ہے۔ اس نے اپنے وجود کے اندر ایک محفل سجائی ہوئی ہے جس میں سبھی کچھ وہ ہی ہے۔ آقا بھی غلام بھی، ہیرو بھی اور ولن بھی بلکہ ہر وہ چیز جس سے اس کی ذات پینٹ ہو سکے۔ نہ اس محفل سے وہ خود باہر نکلنا چاہتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی اور کو شامل کرنا چاہتا ہے۔ اسے دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کا جنون ہے اور اسی جنون کی خاطر وہ کبھی گلیشئر کا روپ دھار لیتا ہے اور کبھی سورج کا۔ پتا نہیں کس کمپلیکس کا شکار ہے۔ وہ اپنی ذات کی بادشاہت میں اتنا گم ہے کہ کسی اور کی پرواہ نہیں کرتا، میں نہیں سمجھتی کہ وہ تانیا کے لئے اچھا شوہر ثابت ہوسکتا ہے تانیا ہی کیا کسی بھی لڑکی کے لئے نہیں۔''

''مجھے تمہارا تجزیہ سو فیصد درست نہیں لگتا، ہاں کچھ باتیں اس میں ایسی ہیں لیکن اتنی شدت کے ساتھ نہیں۔'' وہ بولے۔ ''اور پھر لڑکوں میں یوں بھی خود کو ثابت کرنے کا جنون بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ انہیں عقل آجاتی ہے اور سعدیہ' عباس کا خاندان بھی بہت اچھا ہے۔ میں تانیا کے لئے ایک اچھا فیملی بیک گراؤنڈ چاہتا ہوں۔''

''فیضان بھائی، اس اچھے فیملی بیک گراؤنڈ کا کیا فائدہ جب بذات خود لڑکا اچھا نہ ہو۔''

''بات یہ ہے کہ میں ذرا بزدل واقع ہوا ہوں۔ ہمارے خاندان میں باہر شادی کی روایت نہیں ہے لیکن جب میں خاندان میں نظر دوڑاتا ہوں تو ایک نہیں کئی مسئلے نظر آتے ہیں۔ کچھ لڑکے عمر میں تانیا سے بہت بڑے ہیں اور کچھ بہت چھوٹے۔ کسی کی تعلیم کم ہے اور

کوئی ابھی تک اپنے باپ کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اب طبی نقطۂ نگاہ سے ہمارے خاندان میں کزن میرج خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔

اس لئے اپنی تمام تر بزدلی کے باوجود میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تانیا کی شادی خاندان میں ہرگز نہیں کروں گا لیکن میں اپنے خاندان کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ ہر بڑا فیصلہ کرنے کے لئے ہم اب بھی اکٹھے ہوتے ہیں اور ہر فیصلہ متفقہ طور پر کرتے ہیں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ خاندان سے باہر نکلوں اور پھر کسی عام سے خاندان کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دوں۔ اگر مجھے خاندان سے باہر تانیا کی شادی کرنی ہے تو پھر مجھے اپنے خاندان کے سامنے ایک ایسا اعلیٰ رشتہ رکھنا ہوگا جو انہیں کسی بھی قسم کی مخالفت سے روک سکے۔ ہمارا خاندان بہت اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے اور میں کسی بھی رکاوٹ سے بچنے کے لئے ان کے سامنے ویسا ہی ایک اعلیٰ خاندان کا رشتہ رکھنا چاہتا ہوں۔

اور سچ بات تو یہ ہے سعدیہ، کہ خاندان سے بھی باہر نکل سکتا ہوں لیکن ذات سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ صدیوں سے قائم روایات ہیں اور میں ان سے کسی صورت بھی انحراف نہیں کر سکتا۔''

''تو فیضان بھائی یہ آپ کے ایسے مسائل ہیں جنہیں صرف آپ ہی حل کر سکتے ہیں کوئی دوسرا چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا۔

''تم تو عباس کو پڑھاتی ہو تمہارا اس کے مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

آپ شاید معاشی نقطہ نگاہ سے پوچھ رہے ہیں، اتنے بڑے کاروبار میں اس کا بھی تو کوئی حصہ ہوگا۔''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ اس سارے میں سے ایک دھیلا بھی نہیں لے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''ایسا کہنا آسان ہے کرنا بہت مشکل۔ ہر طالب علم عمر کے اس حصے میں آئیڈیلزم کا شکار ہوتا ہے اور یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اکیلا یہ دنیا فتح نہیں کر سکتا لیکن تعلیمی اداروں کی چاردیواری سے باہر آنے کے بعد یہ دنیا اسے وہ سب کچھ سمجھا دیتی ہے جو ہم سب مل کر بھی اسے سمجھا نہیں پاتے۔ بہرحال اگر وہ حقیقتاً ایسا ہی چاہتا ہے تو پھر اسے مستقبل کی

کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔''

''میرے اندازے کے مطابق وہ خاصا لائق اور ذہین ہے۔'' انہوں نے مجھ سے اختلاف کیا۔

''ہاں۔ لیکن عملی دنیا میں کامیابی کا پیمانہ یہ تو نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی میرا ایک سٹوڈنٹ ہے کامریڈ ظہیر وہ انقلاب لانا چاہتا ہے اس معاشرے میں۔ اس کے اسلام آباد میں کام کرنے والے سینئر بیوروکریٹ باپ نے اسے سول سروس کا امتحان دینے کا حکم دیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اپنی موجودہ قابلیت کے ساتھ اگلے دس سال تک بھی مقابلے کا امتحان پاس نہیں کر سکتا۔ کارل مارکس کے سوا اس نے پڑھا ہی کیا ہے، لیکن اس کے باپ نے اسے تسلی دے رکھی ہے کہ اگر وہ پرچے میں صرف اپنا رول نمبر ہی لکھ آتا ہے تب بھی اس کی سلیکشن یقینی ہے۔''

''خیر ایسا کوئی کام تو عباس کا باپ بھی کروا سکتا ہے۔''

''ہاں اگر عباس دشمن کے کیمپ سے کمک حاصل کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ کرے تو یقیناً وہ کافی آگے بڑھ سکتا ہے۔''

''ہوں'' ان کا انداز پُرخیال تھا، پھر وہ قدرے توقف سے بولے۔ ''کب واپسی کا کہا ہے تانیا نے؟''

''لنچ تک آ جائے گی۔''

''اچھا مجھے تو اب ایک دوست کی طرف جانا ہے شاید زیادہ دیر ہو جائے، آج ہمارا برج کھیلنے کا پروگرام ہے۔''

''جی اچھا۔''

ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چن کر میں تانیا کا انتظار کرنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلدی واپس آ جائے گی کیونکہ بادل برسنے کو تیار تھے لیکن ہوا یہ کہ مینہ تو برس پڑا لیکن تانیا نہیں پہنچی اور وقت تھا کہ گزرتا جا رہا تھا۔ پہلے تو میں یہی سوچ کر دل کو تسلی دیتی رہی کہ وہ ابھی آ جائے گی۔ لیکن جب کافی دیر ہو گئی تو میری پریشانی کا گراف بڑھنے لگا۔ ٹیلی فون انڈکس اٹھا کر میں نے باری باری اس کے سبھی دوستوں کے گھر فون کیا لیکن سب ہی لاعلم تھے۔

میں نے عباس کے گھر فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف ظفر شاہ کی بیوی نے فون ریسیو کیا۔

''میں تانیا کی آنٹی بول رہی ہوں۔'' میری آواز میں خودبخود سرد مہری اتر آئی۔ ''عباس تانیا کو لانگ ڈرائیو پر لے کر گیا تھا اور اب تک وہ اسے واپس نہیں لایا۔''

''اچھا؟'' وہ بولی۔ ''لیکن وہ تو یہاں بھی نہیں آئے کتنی دیر ہوگئی ہے انہیں گئے ہوئے؟''

میں سن ہو کر رہ گئی، اس کی بات کا جواب دیئے بغیر میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور کار کی چابی لے کر باہر بھاگی۔

''صغراں!'' کار نکالتے ہوئے میں نے ملازمہ کو آواز دی۔

''جی بی بی؟''

''اگر تانیا آجائے تو اس سے کہنا کہ مجھے فوراً رنگ کرے۔''

''جی کس نمبر پر؟''

''یہیں کار والے نمبر پر۔'' اور میں نے کار تیزی سے گیٹ سے نکال لی۔

میں نکل تو آئی تھی لیکن اب کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان کی تلاش میں کہاں جاؤں؟ اتنے بڑے شہر میں وہ ڈرائیو کے لئے کہیں بھی جا سکتے تھے۔ بڑی بڑی [illegible]ں اور ان سے نکلنے والی بے شمار چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے اَٹے ہوئے اس شہر میں انہیں کہاں ڈھونڈوں۔ پھر کتنی ہی سڑکوں پر میں یونہی گاڑی دوڑاتی رہی۔ کینال روڈ سے ظہور الٰہی روڈ وہاں سے گلبرگ مین بلیووارڈ، پھر شیر پاؤ برج سے ہو کر کینٹ لیکن یہ ساری تلاش بے سود لگ رہی تھی۔ اس دوران دو تین مرتبہ میں نے گھر فون کر کے بھی پتا کیا لیکن نہ تو تانیا آئی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی فون آیا تھا۔ واپسی پر کینال روڈ سے گزرتے ہوئے میں اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ گھر کی طرف مڑنے کا خیال ہی نہیں رہا اور سیدھے چلتے چلتے میں یونیورسٹی جا پہنچی۔ بارش کے موسم میں نیو کیمپس کا حسن اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے لیکن میں اس قدر پریشان تھی کہ یہ سب باتیں سوچنے کے لئے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ اب جو واپسی کا ارادہ کیا تو دل اتنا بے چین تھا کہ واپس مڑنے کی بجائے میں آگے ہی آگے چلتی

گئی۔ کینال ویو سے کچھ دور پیچھے سنسان سڑک پر عباس کی میٹلک [illegible] کار کھڑی ہوئی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس جل بجھ رہی تھیں۔ میں تیزی سے کار اس کے قریب لے گئی۔

موسلا دھار بارش میں عباس کار کا بونٹ کھولے کھڑا تھا جبکہ تانیا کار کے اندر بیٹھی ہوئی ڈیک پر That The Way Love Goes فل والیوم پر سن رہی تھی۔ اپنے قریب ایک اور کار رکتے دیکھ کر وہ دونوں چونک گئے۔ بارش کی پرواہ کئے بغیر میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

''سوری کار خراب ہوگئی تھی۔'' میرے کچھ بولنے سے قبل ہی بارش میں بھیگا ہوا عباس بولا۔

''سوری'' میں نے چبا چبا کر کہا، میری آنکھوں میں شدید غصے کے آثار پڑھنے مشکل نہیں تھے۔ پھر میں تانیا کی طرف مڑی۔ ''چلو تم کار میں بیٹھو اس طرف کا دروازہ کھلا ہے۔''

''وہ آنٹی'' اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ وہ بھی کار سے اتر آئی تھی اور پوری طرح پانی میں بھیگ گئی تھی۔

''میں نے کہا گاڑی میں بیٹھو۔'' میں نے اسے غصے میں ڈپٹا پھر میں عباس کی طرف مڑی۔ ''اور مسٹر عباس اب زمانہ کافی آگے نکل گیا ہے۔ سنسان جگہ گاڑی خراب کر کے قریب آنے والے حربے اب نہیں چلیں گے۔''

وہ گنگ سا رہ گیا غالباً اسے توقع نہیں تھی کہ میں یہ بات اتنے آرام سے اس کے منہ پر کہہ دوں گی۔

''آنٹی!'' تانیا کو بھی میری بات سے صدمہ ہو رہا تھا۔

''تم چلو۔'' میں نے اسے ڈانٹا اور گاڑی میں دھکیل دیا پھر خود بھی اندر آگئی۔

''آنٹی عباس بھیگ رہا ہے اور گاڑی بھی خراب ہے اسے یونیورسٹی ہاسٹل میں چھوڑ دیں۔'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''میں ویگن نہیں کار چلا رہی ہوں۔'' میں بدستور غصے میں تھی ''اور اس لڑکے کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''آپ عباس کی انسلٹ کر رہی ہیں۔'' وہ بھی غصے میں چلائی۔

''شٹ اپ تم سے گھر چل کر بات کروں گی میں۔''

تانیا کا چہرہ پانی سے بھیگا ہوا تھا لیکن آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کی لکیر ان سے علیحدہ اور بہت واضح تھی۔ آج سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا، ڈانٹ سکتی بھی نہیں تھی اس گڑیا سی بچی کو، لیکن اب یہ کرنا بہت ضروری تھا، اس کا ایک ایک آنسو میرے دل پر گر رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مجھے اندر سے کاٹ رہا ہے میں تو اس کی جلترنگ سی ہنسی سننا چاہتی تھی تاکہ اکیس سال پہلے کی وہ تاریک رات بھول سکوں۔ جب مراد رو رو کر مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا۔ جب وہ اپنی بے گناہی کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ جب وہ مجھ سے مدد کی فریاد کر رہا تھا کہ اس کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

تانیا کی خوبصورت ہنسی میرے اندر تک سکون اور طمانیت کی لہریں دوڑا دیتی تھی لیکن وہی تانیا آج رو رہی تھی۔ میں نے ٹشو پیپرز کا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ بہت سخت ناراض تھی وہ مجھ سے لیکن اب مجھے اس بات کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے عباس کے چنگل سے بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا، ساری عمر کے رونے سے چند دن کا رونا بہتر تھا۔

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی تانیا کار کا دروازہ کھول کر اتر گئی، جب میں اندر پہنچی تو وہ سامنے کہیں نہیں تھی۔

''صغراں تانیا کہاں ہے؟'' میں نے کچن سے آتی ملازمہ سے پوچھا۔

''وہ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔''

میں نے اس کی خوابگاہ کے دروازے پر دستک دی۔

''نو'' اس کی غصے میں بھری آواز آئی۔

میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا گیا۔ تانیا انہی بھیگے کپڑوں سمیت اپنے بستر پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی، میں وہیں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''تانیا!'' میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

''آپ کا دل نہیں بھرا اب تک؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔ ''مزید بھی کچھ رہتا ہے کہنے کے لئے؟''

''ہاں بہت رہتا ہے بہت کچھ کہنا ہے تم سے، لیکن پہلے کپڑے تبدیل کر لو ورنہ بیمار ہو جاؤ گی۔''

''کچھ نہیں ہوتا آپ کہیں جو کچھ آپ کو کہنا ہے۔''

''عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے وہ گھڑی دیکھو۔'' میں نے وال کلاک کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے گھڑی دیکھ لی ہے لیکن غالباً آپ کو وہاں کار دیکھنے کے باوجود یہ نظر نہیں آیا کہ وہ خراب تھی اور عباس اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''اسی لئے منع کیا تھا میں نے اس موسم میں نکلنے سے۔'' میں نے کہا۔ ''معلوم ہے کتنی مشکل سے ڈھونڈا ہے میں نے تم لوگوں کو؟ کیا حالت ہو رہی تھی میری فکر اور پریشانی سے۔''

''فکر والی کیا بات تھی اس میں؟ ہم یہیں تھے اس شہر میں۔ انسان بیمار پڑ جاتا ہے گاڑی تو پھر گاڑی ہے خراب ہو گئی تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ کار میں فون بھی نہیں تھا۔ عباس نے کہا کہ وہ کہیں سے فون کر کے آتا ہے لیکن نہ تو اتنی شدید بارش میں میں اس کے ساتھ مارا ماری کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کے جانے کے بعد اکیلے وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کر سکتی تھی، لیکن آپ نے ایک بات بھی نہیں سنی۔''

''اس لئے کہ میں اس قسم کے لڑکوں کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''آپ پھر عباس کی انسلٹ کر رہی ہیں۔ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے آپ نے اس وقت بھی ایسی بات کی تھی اور نہ صرف عباس بلکہ میری بھی انسلٹ کی تھی۔ میں آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''مجھے تم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے اور تم کان کھول کر سن لو آئندہ تم اس کے ساتھ کہیں بھی اکیلی نہیں جاؤ گی۔''

''سوری میں آپ کا یہ حکم نہیں مانوں گی کیونکہ جتنا عباس کو میں جانتی ہوں آپ نہیں جانتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو وہ کیوں برا لگتا ہے؟''

''تانیا میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ تمہیں عباس سے ملنا ترک کرنا ہوگا۔'' میں

نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

''آپ کون ہوتی ہیں مجھے اس قسم کا حکم دینے والی۔'' وہ چلائی۔

میں سن کر اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے؟ واقعی میں اس کی کون تھی جو اس کے ذاتی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لے۔ باوجود اس کے کہ میں نے اس کی مما کی وفات کے بعد اسے اپنی گود میں پناہ دی۔ اس کے آنسو خشک کیئے، اس کے ہنسنے کے ساتھ ہنسی۔ اس کے رونے کے ساتھ رو پڑی، دن اس کے ساتھ کھیل کر شام اسے پڑھا کر اور رات اس کا چہرہ تکتے تکتے گزار دی۔ پھر بھی میں کون تھی جو اسے حکم دے سکوں؟

میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں میں تو واقعی کچھ نہیں تھی اس کی۔ پھر بھلا کیسے روک سکتی تھی اسے۔

''آئی ایم سوری تانیا میں واقعی غلطی پر تھی۔''

اور میں وہاں سے چلی آئی بغیر ایک نظر تانیا کو دیکھے ہوئے۔

مجھے زندگی میں کوئی بھی پائیدار رشتہ نہیں ملا تھا، شاید مل جاتے لیکن انیس شاہ نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا اور زندگی کی راہوں پر بھٹکنے کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ میرے راستے کی ساری روشنیاں گل کردی تھیں ورنہ شاید اس انیکسی میں میں یوں اکیلے بیٹھ کر اپنے غموں کا ماتم نہ کر رہی ہوتی۔ شاید میرے گرد بھی کچھ چہرے ہوتے، میرے اپنوں کے محبت سے سرشار چہرے۔ اور کچھ نہیں تب بھی کوئی یہ کہنے والا تو نہ ہوتا کہ میں ہوتی کون ہوں۔ اپنے غموں کا بوجھ یوں تنہا تو نہ اٹھانا پڑتا۔

''کیا یہ دنیا
ازل سے ہی اُداس
اور سُونی ہے
یا اسے صرف میرے لئے
اتنا اُداس اور ویران بنایا گیا ہے''

میں راکنگ چیئر پر جھولتی رہی۔ ''انیس شاہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، میری تباہی اور بربادی کے ذمہ دار تم اور صرف تم ہو۔'' تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔

بارش تھم گئی تھی، شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی لیکن بادلوں سے ڈھکے آسمان کی وجہ سے ہر طرف تاریکی کا پردہ تنا جا رہا تھا۔ مجھے کمرے میں گھٹن کا احساس ہونے لگا تو میں باہر لان میں نکل آئی۔ گیلی گھاس پر دو ہیولے سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ گلاب کے کنج سے لے کر املتاس کے درخت تک اور پھر واپس گلابوں تک، میں انہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

''تم بہت بیوقوف ہو ذرا سا ہی تھا ناں انہوں نے تو چپ چاپ ڈانٹ سن لیتیں۔''

''بس پاگل ہو گئی تھی میں اس وقت۔'' تانیا کہہ رہی تھی۔ ''اور اسی پاگل پن میں میں نے کہہ دیا۔ ہوش و حواس میں تو میں کبھی بھی ایسی بے ہودہ بات کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔'' وہ دونوں املتاس کے درخت کی طرف بڑھ رہے تھے اس لئے دور ہوتے ہوئے تانیا کی آواز کسی قدر مدھم ہو گئی۔

''سوری کر لو ان سے۔''

''لیکن کیسے؟ میں اتنی شرمندہ ہوں کہ کیا بتاؤں؟ مانا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ بھی ٹھیک نہیں تھا لیکن پھر بھی مجھے ایسے نہیں کہنا چاہئے تھا۔'' وہ واپس گلابوں کی طرف مڑ رہے تھے اور تانیا کی آواز بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ ''انہوں نے مجھے اتنی محبت دی ہے کہ شاید میری اپنی مما بھی کبھی نہ دے سکتیں۔ اگر مما مجھے منع کرتیں تو کیا میں ان سے یہ بات کہہ سکتی تھی۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن ان کے جانے کے بعد جب احساس ہوا کہ میں نے کیا کہا ہے تو شرمندگی، افسوس اور دکھ کے مارے مجھے بہت رونا آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بدتمیزی کا سوچ سوچ کر مجھ سے رات بھی ٹھیک نہیں گزرے گی۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ابھی جا کر ان سے معافی مانگ لو، وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں فوراً معاف کر دیں گی تمہیں۔''

''معافی تو میں مانگ لوں لیکن پھر مجھے ان کی بات بھی ماننا ہوگی جو مجھے منظور نہیں ہے۔''

''تو حرج ہی کیا ہے اس میں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''یوں بھی ہم شاید ایک آدھ مرتبہ ہی اکیلے ملتے ہیں ورنہ تو کوئی نہ کوئی ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی دوست اور کبھی گھر والے۔

آئندہ کا وعدہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

"بات یہ نہیں ہے عباس۔ اصل بات یہ ہے کہ آنٹی تمہارے وجود اور تمہاری شخصیت کو رد کر رہی ہیں۔ انہوں نے مجھے کامریڈ یا جواد سے ملنے سے منع نہیں کیا صرف تم سے منع کیا ہے۔ وہ تمہاری ذات کی نفی کر رہی ہیں جو مجھے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا عباس نہ میں تمہیں چھوڑ سکتی ہوں نہ آنٹی کو، عجیب کشمکش ہے۔"

"دیکھو تانیا میں تمہاری زندگی میں بہت بعد میں آیا ہوں اور تمہاری آنٹی بہت پہلے۔ اس لئے ان کا حق تم پر بہت زیادہ ہے، میری تمہاری محبت کو کتنا عرصہ گزرا ہے؟ بمشکل ایک سال اور وہ اس وقت سے تم سے محبت کرتی آ رہی ہیں جب تم آٹھ یا نو سال کی تھیں۔ تمہیں تمہاری ماں نہیں ملی تو قدرت نے تمہارے لئے ماں جیسی ایک اور ہستی بھیج دی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ماں کا نہ ہونا کیا ہوتا ہے۔" عباس کی آواز اس کی سوچ کے ساتھ کہیں کھو گئی تھی پھر وہ لمحہ بھر بعد بولا۔ "اب میں چلتا ہوں تم جاؤ ان سے سوری کرو اور یہ وعدہ بھی کہ ہم آئندہ اکیلے نہیں ملیں گے۔"

"ہونہہ، دل جیتنے کے وہی پرانے مجرب نسخے۔" میں واپس کمرے میں چلی آئی۔ "اپنی محبت حاصل کرنے کے لئے محبتوں کی سیڑھیاں استعمال کرنا اور میری معصوم سی تانیا اس کی باتوں میں آ جائے گی۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس۔"

تانیا اندر چلی آئی سر جھکائے ہوئے۔

"آئی ایم سوری آنٹی میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"وہاں کیوں کھڑی ہو یہاں آ جاؤ ناں۔" میں نے اپنے ساتھ والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب چلی آئی لیکن میرے ساتھ بیٹھنے کے بجائے قالین پر بیٹھ گئی اور سر میری گود میں رکھ کر رو پڑی۔

"پتا نہیں میں نے وہ سب کیوں کہا جو آج تک سوچا بھی نہیں تھا، میرے لئے تو آپ

ہی سب کچھ ہیں۔"

میں نے اس کا چہرہ اٹھا کر آنسو پونچھ ڈالے۔

"کوئی بات نہیں کبھی کبھار غصے میں ایسا ہو جاتا ہے۔"

"اور آنٹی اب میں عباس کے ساتھ اکیلے میں کبھی نہیں ملوں گی۔"

میں دیر تک اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی، اتنے میں فون کی گھنٹی بجی میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف جنید تھا۔

"کیا کر رہی ہو؟" رسمی بات چیت کے بعد اس نے پوچھا۔

"میں اور تانیا Moments شیئرز کیا کرتے ہیں، ابھی ابھی اکٹھے باتیں کر رہے تھے۔"

"یونہی بیٹھے بیٹھے بور ہو رہا تھا سوچا کہ تھوڑی سی آؤٹنگ ہونی چاہئے لیکن ظاہر ہے کہ اکیلے میں آؤٹنگ خاک ہو گی۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ تمہیں اس لئے فون کیا ہے کہ شاید تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے وقت دے سکو۔"

"میں تو کچھ مصروف ہوں۔"

"ڈنر تو کرنا ہے ناں تمہیں؟"

"ہاں ارادہ تو ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر میرے ساتھ کر لو کسی اچھے چائنیز میں چلتے ہیں۔"

"ہوں" میں نے ایک نظر تانیا کی طرف دیکھا، جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں بھی تھکن محسوس کر رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے باہر نکلنے سے تھکن دور ہو جاتی۔

تانیا کو احساس ہو گیا تھا کہ میں کہیں باہر جانا چاہتی ہوں اس لئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آنٹی اب میں چلتی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے سر کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی اور پھر جنید سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"پھر میں آرہا ہوں تمہیں لینے۔"

"نہیں میں خود آجاؤں گی تم بتاؤ ڈنر کرنا کہاں ہے؟"

"جہاں تم چاہو۔"

"ہانگ کانگ ٹھیک رہے گا۔"

"تو پھر میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر میں نے نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ جنید کونے والی میز پر بیٹھا ہوا تھا، میں وہیں چل دی۔

"گھر میں بہت بور ہو رہا تھا میں، بوریت سے بچانے اور کمپنی دینے کا بہت شکریہ۔" مجھے دیکھ کر وہ بولا۔

"میں خود بھی کہیں نکلنا چاہتی تھی، صبح سے ہی مصروف تھی اور اب اس وقت خاصی تھک گئی تھی۔"

"اب یہ مینو کارڈ اٹھاؤ اور اچھے سے کھانے کا آرڈر دے دو۔" اس نے کارڈ میری طرف سرکایا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ تمہیں کھانے میں مشروم بہت پسند تھے۔" ہاٹ اینڈ ساور پیتے ہوئے جنید نے کہا۔

"اب بھی ہیں۔"

"میرے پاس بہت سے ڈبے پڑے ہوئے ہیں اس کے، مجھے تو کوئی ایسے خاص پسند نہیں ہیں۔ میں نے سوچا کہ بیکار پڑے رہیں گے اس لئے تمہارے لئے لیتا آیا۔"

"جنید اگر تمہیں یہ یاد ہے کہ مجھے مشروم پسند ہیں تو یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ مجھے یوں بچھ لینا پسند نہیں ہے۔"

"مشروم تو پسند ہیں ناں بس بات ختم۔" اس کے لئے یہ بات گویا اتنی سی تھی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ یوں اکیلے رہنا اب میرے لئے خاصا بور قسم کا مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔" تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "ہر سہ پہر گالف کھیلنے اور ہر شام جم خانہ میں دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے تو نہیں گزاری جاسکتی۔ کچھ نہ کچھ تو تبدیلی آنی چاہئے۔"

"تمہارے تو اچھے خاصے تعلقات ہیں کسی کورس پر باہر چلے جاؤ۔ تبدیلی بھی ہو جائے

گی اور واپسی پر گریڈ میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔" میں نے اسے دوستانہ مشورہ دیا۔

"باہر کے بھی اتنے چکر لگا چکا ہوں کہ اب اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ میں کوئی اور تبدیلی چاہتا ہوں۔" اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اگر کوئی اور تبدیلی لانا تمہارے بس میں ہے تو لے آؤ۔" میں اس کی بات سمجھ گئی تھی اس لئے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب میں امریکہ پہنچا تو تم لندن جا چکی تھیں۔ دو سال بعد لندن گیا تو معلوم ہوا کہ تم فرانس چلی گئی ہو، کچھ عرصہ بعد فرانس جانے کا اتفاق ہوا تو تم روم کی طرف عازم سفر ہو چکی تھی۔ روم میں سیاحت کا پروگرام بنا تو سوچا کہ تمہیں ڈھونڈا جائے، لیکن یہ تلاش بھی بے سود رہی کیونکہ تم جدہ جا چکی تھیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام میں" کا اصل مفہوم کیا ہے۔ ایک مرتبہ سعودی عرب جانے کا پروگرام بھی بنا تھا لیکن میں نے سوچا کہ تمہیں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ اگر قسمت میں کبھی تم سے ملنا لکھا ہے تو اس کے لئے مجھے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں لکھا تو ہر کوشش بے سود ہے۔"

"اور اس مرتبہ بغیر کسی تعاقب کے تمہاری مجھ سے ملاقات ہو گئی۔"

"ہاں۔" وہ ہنسا۔ "اور پتا ہے تم سے ملنے کے بعد مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔"

"وہ کیا؟"

"کہ اب میری عادتیں اتنی بھی نہیں بگڑیں کہ دنیا کی کوئی بھی عورت میرے ساتھ گزارا نہ کر سکے۔ کم از کم ایک عورت ایسی ہے جو مجھے برداشت کر سکے اور میں اسے......" اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب بل منگوا لیا جائے۔" میں نے اس کی بات نظرانداز کر دی۔

اس نے ویٹر کو بل لانے کے لئے کہا اور میری جانب متوجہ ہوا۔ "تم کوئی جواب نہیں دو گی؟"

"تم نے کون سا سوال پوچھا ہے؟" میں بولی۔ "ویسے میری ذاتی رائے ہے کہ تنہائی کا کوئی ایسا مستقل علاج اپنے سر پر مسلط نہیں کرنا چاہئے۔ جو بعد میں تنہائی دور کرنے کا باعث

کم اور سر درد کا باعث زیادہ بنے اور یہ بھی کہ دوستی دوستی رہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لئے دوستی کو کبھی کبھی کسی المیہ انجام سے دوچار نہیں ہونا چاہئے۔''

''اتنے ڈھیر سارے برس گزر گئے لیکن تم نہیں بدلیں۔ کیا تم سچ مچ اب بھی ایسا ہی سوچتی ہو؟''

''ہاں۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب چلنا چاہئے۔''

''ضروری نہیں کہ دوستوں کا ہمسفر بننا کسی المناک انجام کا آغاز ہو۔'' وہ میری کار کے شیشے پر جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''آزمائش شرط ہے۔''

میں نے سنی ان سنی کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆======☆======☆

جنید کی باتوں نے ایک بار پھر مجھے ماضی سے سر ٹکرانے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ سب کچھ جو ہو چکا تھا نہ ہوا ہوتا تو آج میں جنید کی باتوں کے جواب میں ضرور کہہ دیتی کہ:

''ہاں کم از کم ایک مرد واقعی ایسا ہے جو مجھے برداشت کر سکے اور وہ تم ہو جنید۔''

لیکن میں یہ سب کیسے کہتی؟ مجھے تو ہر وقت ہر قدم پر پچھلی زندگی کے سانپ ڈستے رہتے تھے۔ اس ایک واقعے نے میری پوری زندگی تباہ و برباد کر کے رکھ دی تھی۔ میں تو اس وقت آرزوؤں کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں تھی، ابھی تو میں نے خواب دیکھنے بھی شروع نہیں کئے تھے۔ مجھے تو اُمنگوں کی بھی پہچان نہیں تھی، جس وقت انیس نے سب کچھ راکھ کر دیا تھا۔ اس کے بعد میری سب خواہشیں خود ہی دم توڑ گئیں تھیں، لیکن جب ایک مرتبہ میں نے گھر سے باہر نکل کر دنیا کے رنگ دیکھے تو بہت سے خواب آپ ہی آپ میرے دل میں جاگ اٹھے تھے۔ تب سے اب تک میں نے قدم قدم پر اپنے خوابوں کو روندا تھا، پل پل اپنی اُمنگوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹا تھا۔

میری تمام اذیتوں، سب دکھوں اور میری تکلیفوں کا ذمہ دار انیس سمیت یہ سارا معاشرہ تھا جس کی منافقت نے مجھے چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے جرم نہیں کیا تھا پھر بھی مجرم تھی اور احساس جرم و شرمندگی میں مجھے اس معاشرے نے مبتلا کیا تھا جبکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

انیس شاہ سے میری نفرت میں دم بدم اضافہ ہی ہوا تھا، نفرت کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب جب کسی اچھے شخص کا ہاتھ تھام کر تنہائی کے اس صحرا سے نکلنے کی میری خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اور جنید نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا رکھا تھا۔ میں خود کو دیکھتی تھی تو مجھے اپنے ہاتھ بریدہ دکھائی دیتے تھے۔ میرے پاؤں میں آبلے پڑ چکے تھے، نہ ہی میں

ہاتھ بڑھا کر جنید کا سہارا لے سکتی تھی اور نہ ہی اس کے پیچھے دوڑ کر اس کے قدموں کے ساتھ اپنے قدم ملا سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ:

"جب حادثہ حادثے کو سمیٹ لے
تو ہم صرف ایک بار مرتے ہیں"

لیکن میرے اوپر گزرنے والے حادثے کو کسی اور حادثے نے نہیں سمیٹا اور میں بار بار مرتی رہی۔

تنہائی کے اس عذاب سے گزرتے ہوئے دور کہیں بہت دور ایک جگنو چمکا۔ پتہ نہیں وہ جگنو تھا بھی یا محض میرا وہم تھا لیکن میرے جیون کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچنے کے لئے امید کے ایک تنکے کا سہارا ابھی بہت تھا۔

یہ اس دن کی بات ہے جب حسب معمول صبح چائے پیتے ہوئے میں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے بہت سے اخباروں کی شہ سرخیاں پڑھنی شروع کیں۔ ایک خبر پڑھتے ہوئے اس کا باقی حصہ پڑھنے کے لئے میں نے اندر کا صفحہ کھولا۔ خبر پڑھ چکنے کے بعد یونہی سرسری سی نظر اسی صفحے پر بھی ڈال دی۔ بہت سی خبروں کے درمیان چوکھٹے میں لگی ایک تصویر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ تصویر کسی نوزائیدہ بچے کی تھی، بلیک اینڈ وائٹ تصویر والا بچہ نہ جانے تھا ہی بہت پیارا یا مجھے اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے تو یوں بھی بچے بہت پیارے لگتے تھے لیکن میں ان کے قریب جانے سے کتراتی تھی۔

میں نے خبر پر نظر ڈالی، وہ بچہ کسی نے سڑک کے کنارے چھوڑ دیا تھا جو اب یتیم خانے پہنچا دیا گیا تھا۔ اخبار والوں کا خیال تھا کہ کسی شقی القلب عورت نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے یہ غیر انسانی حرکت کی تھی۔

میرا دل کرچی کرچی ہو گیا۔

"شاید ہمارے معاشرے میں عورت کی گردن ہی اتنی پتلی ہے کہ ہر قسم کے جرم کا پھندا بہت آسانی کے ساتھ اس کے گلے میں فٹ ہو سکتا ہے۔" میں نے سوچا۔

کتنی ہی دیر تک میں اس بچے کے چہرے کو تکتی رہی، جس کی اس دنیا میں آمد کی خوشی میں سورج نے اسے کرنوں کا ہار پہنانا تھا۔ چاند کی روپہلی روشنی نے اسے آگے بڑھنے کے

لئے راہ دکھلانی تھی۔ جسے پھولوں اور تتلیوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالنی تھیں۔ اس بچے کو دنیا میں آتے ہی ماں کی گود کی گرمی اور باپ کے دستِ شفقت کی بجائے کھردری سڑک کا ایک گوشہ اور لوگوں کی ٹھوکریں ملی تھیں۔

"شاید میرا مراد بھی کبھی کہیں کسی کو ملا ہو۔" اسی امید پر تو میں واپس آئی تھی لیکن ناکامی کے خوف کی وجہ سے اسے اب تک تلاش کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ بے شک وہ رات بہت سرد بہت سفاک تھی لیکن جس ہستی نے اسے میرے وجود میں محفوظ رکھا تھا، اس وحدہ لاشریک کے قبضہ قدرت سے یہ باہر تو نہیں تھا کہ وہ اس طوفانی اور تاریک رات میں میرے ننھے سے مراد کو بچا سکے۔

اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ماں جی نے اسے کہاں چھوڑا ہوگا۔ یہ سوچنا بھی میرے لئے بہت اذیت ناک اور بہت تکلیف دہ تھا لیکن آج اس بچے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یتیم خانہ ہمارے پرانے گھر سے قریب ہی تھا، ماں جی میرے گڈے سے بیٹے کو اس کے علاوہ اور کہاں لے جا سکتی تھیں؟

یہی سب کچھ سوچتی ہوئی میں یونیورسٹی چلی آئی۔ ابھی میں اپنے آفس کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ مجاہدی صاحب آ گئے۔

"آپ مصروف تو نہیں ہیں ڈاکٹر سعدیہ؟"

"نہیں کوئی ایسی خاص مصروفیت تو نہیں ہے۔"

"میں آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔"

"آئیے۔" میں نے انہیں اندر بلا لیا۔

"میں آپ سے ظہیر اور جواد کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔" میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ بولے۔

"جی ضرور۔" میں بولی۔ "لیکن آئی ایم سوری جواد تو مجھے علم ہے کہ وہ کون ہے لیکن ظہیر کے متعلق یاد نہیں آ سکا۔"

"وہی ظہیر جو مارکسزم کے قبر میں اتر جانے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔"

"اچھا آپ کامریڈ کی بات کر رہے ہیں۔" میں ہنس پڑی۔ "ابھی بالکل بچہ ہے وہ

آپ اس کی باتوں کو محسوس نہ کیا کریں۔ اس کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس نے ذاتی طور پر کمیونزم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی اور نہ ہی اسے کندھا دیا ہے۔ وہ اب بھی اس میں زندگی کی رمق ڈھونڈ رہا ہے یونیورسٹی سے نکلے گا تو خود ہی سدھر جائے گا۔''

''وہ اکثر آپ کے پاس آتا رہتا ہے اس لئے میں نے سوچا آپ اسے بہتر طور پر سمجھا سکتی ہیں۔''

''جی میں اسے ضرور سمجھاؤں گی۔'' میں نہیں چاہتی تھی کہ بقول کامریڈ ظہیر وہ اس وقت اپنے بے نظریئے کے ڈبے کو زور زور سے مداری کی ڈگڈگی کی طرح بجانا شروع کر دیں، اس لئے یہی کہہ کر بات ختم کر دی۔

''اور وہ جواد ہے خدا کی پناہ۔ کل میں شاپنگ کے لئے گیا۔ وہ وہاں لڑکیوں کو امپریس کرنے کے لئے موٹر سائیکل کے عجیب وغریب کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کی گردن کی ہڈی نہیں ٹوٹی بس ایک مرتبہ گرنے کی دیر تھی ایک ہڈی بھی سلامت نہ بچتی۔''

''مجاہدی صاحب، یہ کسی کے سمجھانے کی باتیں نہیں ہوتیں انہیں خود سمجھنا پڑتا ہے۔ میرے یا کسی کے بھی سمجھانے سے اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا جب تک وہ خود نہیں سمجھنا چاہے گا۔ ورنہ میں بولتی رہوں گی اور وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑاتا رہے گا۔''

''لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے سمجھایا ہی نہ جائے۔''

''بالکل آپ کوشش کر دیکھیں شاید وہ مان جائے۔''

''تو کیا آپ اسے نہیں سمجھائیں گی؟ وہ صرف آپ ہی کی بات سنتا ہے۔''

''مجھے اپنی بات رد کیا جانا اچھا نہیں لگتا اس لئے میں اسے صرف مشورہ دوں گی۔''

''کچھ کہیئے تو سہی اسے۔''

میں نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھا لیا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب انہیں یہاں سے اٹھ جانا چاہئے۔ وہ یہ اشارہ پا کر جلد ہی بادل نخواستہ اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور کامریڈ، جواد، صبا اور ندرت اندر آ گئے۔

''میڈم تو مصروف لگ رہی ہیں۔'' جواد بولا۔

''کوئی بات نہیں آ جاؤ۔''

وہ مختلف کرسیوں پر بیٹھ گئے لیکن آج وہ ہمیشہ کی طرح ہلا گلا اور شور شرابہ نہیں کر رہے تھے اور یہ حیران کن بات تھی۔

''خیریت تو ہے؟'' میں نے بغور ان کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے کوئی خاص بات کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے۔''

''جی بالکل خیریت ہے۔'' صبا نے بالوں کی لٹ کے پیچھے سے کامریڈ کی طرف ایسے دیکھا جیسے اسے بات شروع کرنے کا اشارہ کر رہی ہو۔

''ہم یونہی گپ شپ لگانے آئے تھے۔'' کامریڈ بولا۔

''تو لگاؤ نا، چپ کیوں ہو پھر؟''

''میڈم آپ نے کہا تھا کہ آپ یہاں کچھ ڈھونڈنے آئی ہیں پھر وہ چیز آپ کو ملی؟'' ندرت نے پوچھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ دراصل انہوں نے بات کچھ اور کرنی تھی لیکن وہ سیدھے سیدھے مطلب کی بات پر نہیں آنا چاہتے تھے۔

''مجھے ڈھونڈنے سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں رہی سہی امید بھی ختم نہ ہو جائے کیونکہ امید خوف کو جنم دیتی ہے اور خوف امید کو لیکن میں اب ان دونوں حصاروں کو توڑ کر باہر نکل آنا چاہتی ہوں اس لئے قدم بڑھانا ہی پڑے گا۔''

''ہم آپ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟'' صبا نے پوچھا۔

''دعا کرو جسے میں ڈھونڈنا چاہتی ہوں وہ مجھے مل جائے۔''

چند لمحوں تک وہ سب ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

''میڈم ہمیں آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔'' بالآخر کامریڈ نے کہا۔

''کہو۔''

''عباس اور تانیا ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن دونوں ہی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ آپ عباس کو پسند نہیں کرتیں۔''

ان سب کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور سبھی میرے تاثرات پڑھنے کی

کوشش کر رہے تھے۔

''جبکہ ہم سب کا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس کی بات جاری تھی۔ ''اور ان دونوں ہی کا خیال غلط ہے۔''

''پھر؟''

''میڈم آپ انکل سے بات کر سکتی ہیں ناں؟'' صبا نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تانیا کو مجھ تک یہ بات پہنچانے کے لئے سہارے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ کیا وہ مجھ سے اتنی دور ہو گئی ہے؟''

''نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' جواد جلدی سے بولا۔ ''یہ بات تو ہم نے خود ہی بحیثیت دوستوں کے آپ سے کی ہے، تانیا اور عباس کو تو خبر بھی نہیں ہے۔''

''تانیا سے کہنا کہ شام کو مجھ سے ملے۔''

انہوں نے ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہماری کلاس ہونے والی ہے اب ہم چلتے ہیں۔'' ندرت بولی اور وہ سب پلٹ کر دروازے کی طرف چل پڑے۔

''اور ہاں۔'' میری آواز سن کر وہ رک گئے۔ ''کامریڈ مارکسزم کا نہ صرف خاتمہ ہو گیا ہے بلکہ اب تک اس کا چالیسواں بھی منایا جا چکا ہے۔ اس لئے انقلاب اور کارل مارکس کا پیچھا چھوڑ کر پڑھائی کی طرف توجہ دو اور جواد تم لبرٹی مارکیٹ میں بائیک پر کرتب دکھانا بند کر دو ورنہ کسی دن ہمپٹی ڈمپٹی کی طرح چکنا چور ہو جاؤ گے۔ ان حرکتوں سے کوئی بھی امپریس نہیں ہوا کرتا، غالباً میرے علاوہ تم کسی کی کلاس اٹینڈ نہیں کرتے یہی وقت ہے سدھر جاؤ۔''

''جی میڈم!'' وہ سب کان لپیٹ کر باہر نکل گئے۔

اپنی کلاسز لے کر میں ملتان روڈ پر واقع یتیم خانے کی طرف نکل گئی۔ سکیم موڑ پر مڑتے ہی بہت سی یادیں امڈ آئیں، لیکن اتنے ہجوم اور ٹریفک کے درمیان مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا، پہلے لاہور اتنی دور تک پھیلا ہوا نہیں تھا۔ یہ علاقہ خاصا سنسان اور غیر آباد قسم کا تھا لیکن اب تو یوں لگتا تھا کہ آج شہر کے سبھی لوگوں نے ملتان کا رخ کرنے کی قسم کھا لی ہے۔ یتیم خانے میں کار روک کر چند لمحے میں اندر ہی بیٹھی رہی۔

آج میں امید اور خوف کے حصار توڑنے آئی تھی، یہ امید کہ شاید میرا مراد مجھے جیتا جاگتا مل جائے اور یہ خوف کہ شاید زندگی کی باقی بازیوں کی طرح یہاں بھی ہار میرا مقدر نہ بن جائے اور میں یونہی تن تنہا بھٹکتی رہوں۔

اللہ کا نام لے کر میں نے قدم باہر نکالا اور دعائیں پڑھتی ہوئی عمارت میں داخل ہو گئی۔

''دسمبر 1970ء کا ریکارڈ چاہئے آپ کو؟''

''پورے مہینے کا نہیں بس پندرہ دنوں کا، دس دسمبر سے پچیس دسمبر تک کا۔'' میں بولی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ''مجھے ایک بچے کی تلاش ہے جو ان دنوں کھو گیا تھا۔''

''اس کے لئے آپ کو چند دن انتظار کرنا پڑے گا ویسے ہم اپنا ریکارڈ یوں دے نہیں سکتے لیکن آپ پروفیسر ہیں اس لئے ہمیں آپ پر پورا بھروسا ہے۔ پر میڈم یہ دھیان رہے کہ آپ جلد از جلد یہ ریکارڈ واپس کر دیں گی۔''

''ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کاغذات مجھے دے دیں میں فوٹو اسٹیٹ کروا کے آپ کو اصل کاغذات اسی وقت واپس کر دوں گی۔''

''یہ ٹھیک رہے گا بلکہ ایسا کرتے ہیں میں آپ کو فوٹو اسٹیٹ ہی دے دوں گا، آپ اپنا فون نمبر دے جائیں تاکہ آپ سے رابطہ قائم ہو سکے۔''

میں نے پین پرس میں سے نکال کر فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

''اگر میں نہ ہوں تو آپ پیغام مت چھوڑیئے گا اکثر اوقات ملازمین بھول جاتے ہیں۔''

''جی بہتر'' میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی اس کا علم ہو۔

شام کو میں ٹی وی دیکھ رہی تھی جب تانیا چلی آئی۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا؟'' اس کے انداز میں جھجک تھی۔

''ہاں بیٹھو۔'' میں نے ٹی وی بند کر دیا۔

''جی۔''

''تمہارے دوست تمہاری خواہش پر میرے پاس آئے تھے؟''

''نہیں میں نے انہیں نہیں کہا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ آپ کے پاس کیا بات کرنے جا رہے ہیں۔''

''تم نے انہیں روکا نہیں؟''

''نہیں۔'' وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''کیوں؟''

''اگر میں عباس کی بجائے کسی اور کے ساتھ انوالو (Involve) ہوتی تو انہیں روک دیتی اور خود ہی بات کرتی لیکن ابھی مجھے ڈر تھا کہ آپ بات سنیں گی ہی نہیں۔''

''ہوں'' میں نے مضطرب ہو کر انگلیاں چٹخائیں۔ ''اگر تم نے عباس کو نہ چنا ہوتا تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اگر میری بات کی تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں ہے تو سمجھ لو کہ میں عباس کو تمہارے لئے مناسب نہیں سمجھتی۔''

''کیوں آنٹی؟'' وہ سراپا سوال تھی التجا تھی۔ ''آخر کوئی وجہ تو ہوگی، میں عجیب دوراہے پر کھڑی ہوں۔ میں آپ دونوں کو ہی نہیں چھوڑنا چاہتی۔ چھوڑ سکتی بھی نہیں۔'' اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔ ''میں نے بہت کوشش کی کہ آپ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آؤں لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ کچھ عرصہ اور ایسے حالات رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ آنٹی آپ کو تو میری ہر خوشی عزیز تھی میں ہنستی تھی تو آپ ہنستی تھیں۔ میں روتی تھی تو آپ بھی رو پڑتی تھیں، پھر اب آپ کا دل کیوں نہیں دُکھتا جب میرا دُکھتا ہے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو کیوں نہیں بہتے جب میری آنکھوں سے بہتے ہیں۔ آپ اب مجھے کیوں ہنسنے نہیں دینا چاہتیں؟'' اس کی پلکیں مسلسل بھیگ رہی تھیں۔

''تانیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ تم کس چیز کی آرزو کر رہی ہو۔'' میں بھی اس کے دکھ پر آزردہ تھی لیکن کیا کرتی۔ ''میرا دل اب بھی تمہیں دکھی دیکھ کر دکھتا ہے، لیکن میں تمہاری بات مان کر تمہاری خوشیوں کو مختصر نہیں کرنا چاہتی۔ تمہیں عباس کے حوالے کر کے شاید میں پھر کبھی تمہاری مسرت بھری ہنسی نہ سن سکوں۔ یہ عذاب مختصر ہے تم رو رو کر اسے گزار لو گی۔ پھر کوئی بہت اچھا شخص جب تمہارا ہاتھ تھام لے گا تو تم یہ سب باتیں بھول جاؤ گی، میں تمہارے ہونٹوں پر ہمیشہ ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''آپ یہ کیوں سوچتی ہیں کہ عباس مجھے خوش نہیں رکھ سکے گا۔ یقین کریں آنٹی میں اس کے علاوہ کسی کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ ایک وہی ہے جو مجھے خوشیاں اور مسرتیں دے سکتا ہے اور کوئی نہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ مجھے قائل کرنا چاہتی تھی۔

''کتنی اچھی طرح؟''

چند ثانیے وہ الجھن سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی تو اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''بہت اچھی طرح، ایک ایک بات، ایک ایک عادت سب کچھ میں تو اس کے سب تیور بھی جانتی ہوں۔''

''بس یہی جانتی ہو؟''

''کیا اس کے علاوہ بھی کچھ رہ جاتا ہے جاننے کے لئے؟'' اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں بہت کچھ۔'' میں بولی۔ ''اس کے باپ کا نام جانتی ہو تم؟''

اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ بتا دیا جائے۔

''جی ہاں اور میں نے انکل ظفر کو آپ سے ملوایا بھی تھا۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''لیکن ظفر شاہ اس کا باپ کب ہے؟''

''کیا مطلب؟'' اس کے لہجے میں حیرت اتر آئی۔

''جاؤ عباس سے پوچھو کہ اس کے باپ کا نام کیا ہے۔ اگر وہ ظفر شاہ کا نام لے تو سمجھو کہ وہ غلط کہہ رہا ہے اور ناقابل اعتبار اور ناقابل اعتماد ہے۔ اگر وہ کچھ اور نام بتائے تو اس سے پوچھنا کہ وہ دنیا کے سامنے ظفر شاہ کو کیوں اپنا باپ ڈیکلئر کرتا پھرتا ہے۔''

''آنٹی!'' وہ گنگ رہ گئی۔

''اب جاؤ۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' تانیا کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتی۔''

''آپ یہ بات کر رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ عباس کے گھر والوں کو جانتی ہیں۔''

''میں نے کبھی کسی کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی لیکن بعض اوقات انسان خود ہی اپنے نقاب اتار دیتے ہیں۔''

''آنٹی آپ کچھ چھپا رہی ہیں مجھ سے۔''

''اس سے زیادہ کچھ بھی جاننا تمہارے فائدے میں نہیں ہے کہ عباس پر اعتبار کرنا تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔''

''آنٹی پلیز کھل کر بات کریں ورنہ میرا دماغ سوچ سوچ کر چیخ جائے گا۔'' اس نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ ''عباس کے ڈیڈی کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ انکل ظفر سے اس کا کیا رشتہ ہے؟''

''بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ عباس اپنے باپ کا دوسرا روپ ہے سر سے پاؤں تک ہو بہو، شکل بھی عادتیں بھی۔ اس پر اعتبار مت کرنا اب جاؤ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

تانیا کی آنکھوں میں ڈھیروں سوال، الجھنیں اور التجائیں تھیں لیکن میں نے سب کچھ نظر انداز کر دیا۔ وہ تھکے تھکے الجھے الجھے قدموں سے پلٹ گئی۔

اگلے چند دن وہ اسی طرح چپ چپ مضطرب سی رہی سوچ میں گم۔

اس دن عباس برآمدے میں ہی الجھ پڑا۔

''مصیبت کیا ہے تمہیں کیوں اتنی گم صم ہو؟''

''کچھ نہیں تمہارا وہم ہے۔'' تانیا نے کہا۔

''یہ میرا وہم نہیں ہو سکتا میں اچھی طرح جانتا ہوں تمہیں کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔''

''کتنی اچھی طرح جانتے ہو؟'' تانیا کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ ''اتنا ہی جتنا میں تمہیں جانتی ہوں۔''

''کیا آنٹی سے ڈانٹ پڑی ہے جو اتنا منہ سوجا ہوا ہے؟''

''آنٹی نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا، ہمیشہ وہ راہ دکھائی ہے جس پر چلتے ہوئے میرے پاؤں میں کانٹے نہ چبھ سکیں لیکن میری بدقسمتی ہے کہ میں جانتے بوجھتے ہوئے کانٹوں پر چلنے کے لئے مصر ہوں اور کسی معجزے کے انتظار میں ہوں۔''

''تم مجھ سے کچھ چھپاتی تو نہیں ہو تانیا، پھر آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ، میں حل کروں گا شیئر تو کرو مجھ سے۔''

میں نے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے آفس کا دروازہ ویسے ہی ادھ کھلا چھوڑ کر اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔

بالآخر تانیا پر کچھ اثر ہو ہی گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے جھوٹ نہیں بولتی، اسی لئے وہ آنکھیں بند کر کے میرا یقین کر لیتی تھی لیکن اب اس کے دل اور دماغ کے درمیان جنگ جاری تھی، اسے صرف ایک محبت مل سکتی تھی اور اس ایک محبت کے حصول کے لئے اسے دوسری محبت کا گلا گھونٹنا ضروری تھا۔ وہ شاید اپنی زندگی کے سب سے بڑے بحران میں مبتلا تھی لیکن اسے باہر نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

دو دن بعد تانیا کی سالگرہ تھی، میں لان میں چہل قدمی کے لئے نکلی تو وہ بھی گھاس پر کتابیں پھیلائے نوٹس بنا رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اپنے کام میں مصروف رہی میں اس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟''

''آپ نے جو اسائنمنٹ دی تھی وہی کر رہی ہوں۔'' وہ کتاب کے صفحات اُلٹنے لگی۔

''اس دفعہ سالگرہ منانے کا پروگرام ہے؟''

''ہے تو نہیں لیکن سب دوستوں کا اصرار ہے کہ ٹریٹ دینی ہی پڑے گی۔''

''تو کیا حرج ہے دے دو۔''

''سب چاہتے ہیں کہ اس مرتبہ یہاں گھر میں ڈنر کریں۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ اکتائی ہوئی تھی۔

''دل چاہنا چاہئے تمہارا اپنے لئے نہیں تو میرے لئے۔'' میں اسے کب دکھی دیکھ سکتی تھی اچھا تھا دوستوں میں رہ کر کچھ خوش ہو جاتی۔

''یہ اچھا نہیں لگتا ناں آنٹی کہ سب کو بلایا جائے اور ایک کو چھوڑ دیا جائے۔''

''ہوں تو یہ مسئلہ ہے۔'' میں نے سوچا۔

''میں نے تمہیں سب کی موجودگی میں عباس سے ملنے سے نہیں روکا اور نہ ہی یکدم قطع تعلق کرنے کو کہا ہے۔'' میں بولی۔ ''کیونکہ اس طرح ایک دم سے کسی سے ترک تعلق کر لینے

سے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے فاصلہ رکھو اور آہستہ آہستہ دور ہو جاؤ۔"

اس نے شاکی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کتابیں اور فائل اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔

اگلے دن اس کے سب دوستوں نے میرے آفس میں ہلا بول دیا۔

"میڈم ہم آپ کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھائیں گے۔" جواد حسبِ عادت چلایا۔

"تانیا نے اتنی تعریف کر رکھی ہے کہ اب یہ موقع ہم نے ہاتھ سے نہیں جانے دینا۔" صبا نے کہا۔

"چاہے آپ کو کتنا بھی کام ہو سالگرہ کے دن یہ مینو ہر حال میں آپ نے ہی تیار کرنا ہے۔" کامریڈ نے اپنی میلی جینز کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا برآمد کیا۔

"پرے رکھو اسے۔" میں نے ناک سکیڑی۔ "اور کبھی اپنی پتلون دھو بھی لیا کرو۔"

"یہ دُھل کب سکتی ہے اب تو کوئی لانڈری بھی اسے لینے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ بس ایک ہی طریقہ ہے کہ ساری کلاس چندہ کر کے کامریڈ کو نئی پتلون گفٹ کر دے اور اس کی یہ پرانی جینز ڈسٹ بن میں پھینک دی جائے۔" ندرت نے کہا۔

"یہ اچانک ہی میری اس عزیز از جان جینز پر اٹیک کیوں شروع ہو گیا؟" اس نے مصنوعی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"ایسا تو بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔" میں بولی۔ "اور آئندہ اس جینز سمیت میرے آفس میں مت آنا کیونکہ یہاں ایگزاسٹ فین نہیں ہے جو اس کی بو باہر نکال سکے۔"

"یہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ نہیں ہو گئی۔" اس نے جواد سے کہا اور پھر اپنے گول شیشوں والے چشمے کے پیچھے سے جھانکا۔ "ویسے میڈم کھانا نہ پکانے کا اچھا بہانا ہے۔" اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا ہوا میں لہرایا۔

"ندرت اس سے کاغذ لے کر کسی صاف کاغذ پر یہ مینو اتار دو لیکن کامریڈ یہ کھانا تم تب ہی کھاؤ گے جب اس دن صاف ستھرے کپڑوں میں شیو کر کے اور بالوں کو انسانوں کی طرح برش کر کے آؤ گے، ورنہ دوسری صورت میں چوکیدار تمہیں گیٹ سے باہر پھینک دے گا۔"

سب نے تالیاں بجا کر میرے اس حکم کی تائید کا اعلان کیا۔

"کامریڈ اب یہاں سے بھاگنا ہی پڑے گا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔" یہ کہہ کر وہ دُم دبا کر آفس سے بھاگ گیا۔

"خاصا چٹورا ہے یہ کامریڈ۔" میں نے ڈنر کے لئے ڈشیں تیار کرتے ہوئے سوچا۔ "اتنی ساری رنگ برنگی ڈشیں تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔"

تانیا کا موڈ بھی کچھ بہتر تھا اور وہ اپنے کپڑوں کا انتخاب کرنے میں مصروف تھی۔ شکر ہے تانیا بھی آہستہ آہستہ اس حقیقت کو قبول کر رہی ہے ورنہ اس کے ڈپریشن کو دیکھ دیکھ کر میرا دل ڈوبتا تھا۔

"بی بی آپ کا فون ہے۔" صغراں نے فون میرے ہاتھ میں پکڑایا۔ دوسری طرف جنید تھا۔

"تمہیں اتنے لمبے عرصے کے لئے گم ہو جانے کی عادت کیوں ہے؟" اس نے شکوہ کیا۔

"میں مصروف تھی۔"

"تمہاری مصروفیت ختم بھی ہو گی کیا؟ جب فون کرو تم مصروف ہوتی ہو اور ملازمین کو حکم ہے کہ لکھتے پڑھتے ہوئے تمہیں کوئی فون نہ ملایا جائے، کچھ تو خیال کر لیا کرو میرا۔"

"ابھی کس لئے فون کیا ہے؟" میں نے کیبنٹ میں اجینو موتو کی شیشی تلاش کرنی شروع کی۔

"اتنی بے اعتنائی کی توقع نہیں تھی ورنہ فون نہ کرتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، دراصل میں کھانا پکا رہی ہوں، اس لئے پوچھ رہی تھی کہ کوئی خاص کام نہ ہو تو بعد میں رِنگ کر لینا ورنہ باتوں کے دوران مجھے دنیا کے باقی سب کام بھول جاتے ہیں۔"

"تم باتیں کرتی ہی کتنی ہو پورے دن کی ہوئی تمہاری باتیں انسان انگلیوں پر گن سکتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ تم کیوں کچن میں گھسی ہوئی ہو، خانساماں کی پرابلم ہو تو میں ابھی اپنا بھجوا دیتا ہوں۔"

''ارے نہیں ایسی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ تانیا کے کچھ دوستوں نے آنا ہے آج اور ان کا اصرار ہے کہ کھانا مجھے ہی تیار کرنا ہوگا۔''

''بہت خوش قسمت ہیں اس کے دوست جن کی فرمائش تم پوری کر رہی ہو، ہاں یہ بتاؤ کہ وہ مشروم پکائے؟''

''ابھی تک نہیں البتہ آج ارادہ ہے۔''

''اچھا تم کام کرو اور کبھی کبھار مجھ غریب کو بھی یاد کر لیا کرو۔''

میں نے فون بند کر کے وہیں کیبنٹ کے اوپر رکھ دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گھنٹی پھر بج اٹھی، یہ فون یتیم خانے کی طرف سے تھا۔

''کاغذات مل گئے ہیں؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''جی میڈم میں نے فوٹو کاپی بھی کروالی ہے سب کی۔ آپ آج کسی وقت آ کر لے لیں۔''

میں خانساماں کو ہدایت دے کر اسی وقت یتیم خانے کی طرف چل دی۔ کاغذات خاکی رنگ کے بڑے سے لفافے میں بند تھے، گھر آ کر میں نے جلدی سے وہ لفافہ اتار پھینکا لیکن کاغذوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے اپنی پوری ہمت مجتمع کی لیکن میرا ہاتھ ان کاغذوں کو نہ چھو سکا۔

''اگر وہ نہ ملا تو؟'' یہ خوف مجھے ہاتھ آگے بڑھانے سے روک رہا تھا۔ یہ آس یا تو آج دم توڑ جاتی یا پھر حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے مجسم ہو جاتی لیکن میں ہمت کہاں سے لاتی وہ کاغذات کھول کر پڑھنے کی۔ بہت مشکل سے آنکھیں بند کر کے میں نے ان کاغذوں کو اٹھایا اور اپنی سٹڈی ٹیبل کی دراز میں بند کر کے باہر نکل آئی۔

کچن میں آ کر خانساماں کو ایک مرتبہ پھر ہٹا کر میں کام میں مصروف ہوگئی۔ شام سات بجے سب کچھ تیار تھا، تانیا کے ڈیڈی حسبِ معمول برج کھیلنے جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس کے دوست آنے لگے۔ صبا، ندرت، جواد اور عباس آ چکے تھے، میں ان کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ سب ہی باتیں کر رہے تھے لیکن عباس پوری گفتگو کے دوران ایک مرتبہ بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ اس نے مجھے یوں فراموش کر دیا تھا جیسے میں یہاں سب

کے درمیان ہوں ہی نہیں۔ تانیا اب بھی ہم دونوں کے درمیان پُل بننے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن یہاں فاصلے پاٹنا ہی کون چاہتا تھا؟

''کامریڈ اب تک کیوں نہیں آیا، اتنی دیر ہوگئی ہے۔'' صبا نے کہا۔

''پتہ نہیں کہہ تو رہا تھا کہ وقت پر پہنچ جائے گا۔'' عباس نے گھڑی دیکھی۔

''اسے اس کے حلیئے کی وجہ سے کوئی لفٹ دینے پر تیار نہیں ہوا ہوگا۔'' صبا نے خیال ظاہر کیا۔ ''اتنا حوصلہ جواد کے سوا اور کسی میں نہیں ہے کہ اسے روز بائیک پر بٹھا کر مطلوبہ جگہ ڈراپ کر دے۔''

''میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اسے پک کروں یا نہیں لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔'' جواد بولا۔

''ذرا فون کر کے پتا کرو کہاں رہ گیا ہے۔'' ندرت نے عباس سے کہا۔

اس نے فون اپنی طرف کھسکا لیا لیکن نمبر پوری طرح ڈائل نہیں ہوا تھا کہ سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔

''یہ کون آ گیا اس وقت؟'' تانیا کسی بن بلائے مہمان کی آمد کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لئے جھلا اٹھی۔

''کامریڈ ہی ہوگا۔'' صبا نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاہاہا'' جواد نے قہقہہ لگایا۔ ''ان کی شکل ہے بی ایم ڈبلیو پر آنے کی۔''

''ہاں وہ تو ہمیشہ لفٹ لے کر آتا ہے جواد سے۔'' تانیا نے بھی تردیدی بیان جاری کر دیا۔

پھر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی کامریڈ کو دیکھ کر سب ہی حیران رہ گئے۔ وہ کامریڈ ہی تھا لیکن اسے پہچاننا بہت مشکل تھا، ہیرڈ کی صاف ستھری قمیص پتلون، پاؤں میں بروکس، شیو کی ہوئی ناک پر دھرا ہوا گول چشمہ غائب اور جیل بیکڈ بالوں نے اسے بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

''میں اپنے اس حلیئے پر پہلے ہی بہت شرمندہ ہو چکا ہوں، اب تم سب یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو گے تو مجھے اور شرمندہ ہونا پڑے گا۔'' وہ آتے ہی بولا۔

"یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے تم نے اپنا۔" جواد بولا۔

"میڈم کا حکم تھا اور میں سب کی بات ٹال سکتا ہوں سوائے میڈم کے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"آج انسان لگ رہے ہو۔" میں بولی۔

"ایسا بھی کیا انسان بننا کہ گھر والے اور دوست تک شناخت نہ کر سکیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میں سارے راستہ جل تُو جلال تُو کا ورد کرتے ہوئے آیا ہوں۔ کہیں راستے میں ایکسیڈنٹ ہو جاتا اور میں مر مرا جاتا تو کوئی لاش بھی نہیں پہچان سکتا۔"

"اس قسم کی فضول باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔" میں نے اسے ڈپٹا۔

"میڈم آپ نے میرا والا مینو بنایا ہے، قسم سے اس کھانے کے پیچھے میں نے اپنی یہ ہیت کذائی کر ڈالی ہے۔"

"سب کچھ تیار ہے بلکہ میں نے مشروم بھی پکائے ہیں جو تمہارے مینو میں شامل نہیں تھے، تم میں سے کسی کو مشروم پسند ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"چکن کی ڈشوں کے ہوتے ہوئے مشروم کون کھائے گا؟" کامریڈ بولا۔

"تو کسی کو پسند نہیں ہیں مجھے بہت زیادہ اچھے لگتے ہیں۔"

"صرف عباس کو پسند ہیں اور یہاں کوئی بھی مشروم نہیں کھاتا۔" تانیا نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اب چلتی ہوں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی، وہ کاغذات میرے ذہن میں مسلسل ہلچل مچا رہے تھے۔

"بیٹھیں ناں آنٹی ڈنر ہمارے ساتھ کر کے جائیں۔" تانیا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے بہت ضروری کام ہے بیٹا ورنہ میں ضرور بیٹھتی۔" میں نے نرمی سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ "تم لوگ انجوائے کرو۔"

کمرے میں راکنگ چیئر پر بیٹھ کر میں نے سب کاغذات اپنی گود میں رکھ لئے، کتنی دیر گزر گئی۔ پھر مرکزی مکان کی جانب سے بانسری کی خوبصورت آواز آنے لگی۔

"یہ بانسری کون بجا رہا ہے؟" میں نے سوچا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ تانیا نے عباس کا تعارف کچھ ایسے ہی کرایا تھا کہ "یہ ہر صبح اپنی ذات کی آرتی ایسے اتارتا ہے اور اپنی دوستیوں کے لئے مرن بھرت تک رکھ سکتا ہے اور جب ان کاموں سے فارغ ہوتا ہے تو مرلی لے کر بیلے میں نکل جاتا ہے۔"

"تو یہ بانسری عباس بجا رہا ہے۔" میں نے سوچا۔

پھر میری ذہنی روانی کاغذات کی طرف مڑ گئی۔

"میرے پاس کچھ اور کھونے کو ہے ہی نہیں۔" میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ "اگر مجھے میرا ننھا سا گڈا مراد مل گیا تو زندگی میں پہلی مرتبہ میرے ہاتھ میں کوئی سچی خوشی آئے گی اور نہ ملا تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں میں کچھ نہیں کھوؤں گی میرے ہاتھ تو ویسے ہی خالی ہیں۔"

میں نے سب سے اوپر رکھا ہوا کاغذوں کا چھوٹا سا پلندا اٹھا لیا۔ اسی سے میری سب سے زیادہ امید وابستہ تھی کیونکہ یہ دسمبر کے کاغذات تھے۔ اسی سرد تاریک رات میں میرا مراد مجھ سے بچھڑا تھا۔ میں ابھی ان کاغذات کو دیکھ نہیں پائی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا، دوسری طرف جنید تھا اور اس کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"تم ٹھیک ہو ناں سعدیہ؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں بالکل۔" میں کچھ نہیں سمجھی۔

"اور تم نے وہ مشروم تو نہیں کھائے؟"

"ابھی نہیں تھوڑی دیر بعد کھانا کھاؤں گی۔"

"تھینک گاڈ!" اس نے سکون کا سانس لیا۔

"کیا ہوا؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"وہ مشروم کھانا بھی مت۔" وہ بولا۔ "آئی ایم سوری لیکن مجھے ابھی پتہ چلا ہے کہ اس برانڈ کے جتنے ڈبے امپورٹ کئے گئے ہیں ان سب میں زہریلے مشروم ہیں۔ کل صبح کے اخباروں میں اس سلسلے میں اشتہار بھی آ جائے گا اور ایسے تمام ڈبے ضبط کر کے اس کمپنی کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔"

"بروقت اطلاع دینے کا شکریہ۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں کل ہی میں کوئی بندہ بھیج کر وہ ڈبے منگوا لوں گا اور نئے برانڈ

کے ڈبے بھیج دوں گا۔"

"کوئی بات نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم تکلفات میں مت پڑا کرو دوستی میں تکلفات کیسے؟"

فون رکھ کر میرا ذہن تانیا کی طرف چلا گیا یہ ڈش وہاں بھی موجود تھی۔ میں تیزی سے باہر نکلی، ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے تانیا کی آواز نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

"صرف عباس کو پسند ہیں اور یہاں مشروم کوئی بھی نہیں کھاتا۔" میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ یہ بہت اچھا موقع تھا انیس شاہ سے بدلا لینے کا۔ اس نے میری زندگی تباہ کی تھی میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کیا تھا۔ جو خدا معلوم زندہ بھی تھا یا نہیں، مجھے تنہائی کا عذاب بھگتنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میرا ساری آرزوؤں، میرے خوابوں کو پامال کیا تھا اور پھر اس طرح تانیا کو بھی عباس سے چھٹکارا مل جاتا اور اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جاتی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھا، اندر سے سب کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی اور سب کے درمیان عباس کا قہقہہ آسانی سے پہچانا جاسکتا تھا۔ میں چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔

"جاؤں یا نہ جاؤں؟"

ڈرائنگ روم کا دروازہ اب بھی میری نظروں کے سامنے تھا۔ عباس کی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے بعد میرے ہاتھ میں تھی اور جب زندگی اور موت کا ترازو ذاتی عداوت کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے تو پھر ایک ہی فیصلہ ہوتا ہے۔ میں اُلٹے قدموں اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔

جتنے دکھ انیس شاہ نے مجھے دیئے تھے ان کے بدلے سارے جہاں کی خوشیاں مجھے مل جاتیں تب بھی ان دکھوں کا مداوا نہیں ہوسکتا تھا لیکن اس کے بیٹے کی موت مجھے کچھ نہ کچھ سکون ضرور دیتی۔

میں واپس راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی اور تپائی پر رکھے کاغذوں کا پلندہ اٹھا لیا۔ پہلے صفحے پر دس دسمبر کی تاریخ تھی، میں نے دھڑکتے دل سے صفحے پر نظریں دوڑائیں۔

دس دسمبر کو ایک ہی نوزائیدہ بچہ ملا تھا، وہ یتیم خانے کے برآمدے میں کمبل میں لپٹا ہوا پایا گیا تھا اور اس پر سب سے پہلے ایک خاکروب کی نگاہ پڑی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس بچے سے متعلق کاغذات ساتھ ہی منسلک تھے میں نے جلدی جلدی نگاہیں دوڑانی شروع کیں۔

یتیم خانے والوں نے بچے کا نام امجد رکھا تھا، ماں کا نام نامعلوم اور باپ کے نام کے خانے میں بھی نامعلوم درج تھا۔ سات سال کی عمر تک وہ بچہ اسی یتیم خانے میں رہا تھا پھر ایک مخیر بزنس مین نے اسے گود میں لے لیا تھا۔ اس بزنس مین کا نام ظفر علی شاہ تھا، کاغذوں پر میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی۔ ہو نہ ہو وہ میرا مراد ہی تھا میں نے ریسیور اٹھا کر کانپتے ہاتھوں سے ظفر شاہ کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ عرصہ پہلے تانیا کا پتہ کرنے کے لئے میں نے ان کے گھر فون کیا تھا، تب سے یہ نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ گھنٹی جارہی تھی دوسری طرف سے فون کسی عورت نے اٹھایا۔

"مجھے مسٹر ظفر شاہ سے بات کرنی ہے۔" میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"کہئے میں ان کی بیگم بول رہی ہوں۔"

"آج سے تقریباً چودہ برس قبل تم لوگوں نے میرا بیٹا گود لیا تھا، جب وہ سات سال کا تھا اب میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"کیا عجیب باتیں کررہی ہو تم؟ ہم نے کسی کا بیٹا گود نہیں لیا تم ہو کون؟"

"میں مراد کی ماں ہوں جس کا نام یتیم خانے میں امجد رکھ دیا گیا تھا اور تم لوگوں نے اسے گود میں لیا تھا۔" میں چلائی۔

"کون ہو تم؟" ظفر شاہ کی بیوی کی آواز میں خوف تھا۔

"میں وہی ہوں جو تمہارے بھائی انیس شاہ کے پاس فریاد لے کر آئی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو اپنا نام دے دے اور جسے تم لوگوں نے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔" میرا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا جارہا تھا اور آنکھوں میں نمی آتی جارہی تھی۔

"میں ایسے کسی واقعے کو نہیں جانتی، آئندہ یہاں فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر نمبر ڈائل کیا گھنٹی بجتے ہی فون ظفر شاہ نے اٹھالیا۔

''تم لوگوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے اب میں تمہیں اپنا بیٹا نہیں چھیننے دوں گی۔ مراد میرا بیٹا ہے وہ جہاں ہے جس حال میں ہے مجھے واپس کردو۔''

''تم سے کس نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا بیٹا ہمارے پاس ہے۔'' اس کی کڑک دار آواز ابھری۔ ''جن لوگوں کی اپنی اولاد ہوتی ہے وہ یتیم خانوں سے بچے گود نہیں لیتے۔''

''بکواس مت کرو۔'' میں چلائی۔ ''میں اپنے بیٹے کے لئے سب کچھ کرگزروں گی ظفر شاہ۔ یہ کاغذ میرے پاس ہیں انہیں بھی جھٹلاؤ گے کیا؟ ان پر تمہارے اپنے ہاتھ کے دستخط ہیں، تمہارے مکان کا پتہ لکھا ہوا ہے، اسی مکان کا جس میں تم اب بھی رہ رہے ہو۔''

''میرے نزدیک کسی بھی کاغذ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسے بیسیوں جعلی کاغذات میں بنوا سکتا ہوں ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔''

''یہ جعلی کاغذات نہیں ہیں یتیم خانے میں بھی اس کی کاپیاں موجود ہیں تم لوگ انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔''

''میں مزید کوئی لامعنی بات نہیں سن سکتا۔''

''تو تم نہیں بتاؤ گے ٹھیک ہے نہ بتاؤ لیکن یاد رکھنا کہ تمہارے بیٹے عباس شاہ کی زندگی اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ چند لمحوں میں زہر اس کے حلق سے اتر کر معدے میں پہنچ جائے گا اور اسے خبر بھی نہیں ہوگی۔ بہت شوق ہے ناں اسے مشروم کھانے کا، وہ سب زہریلے مشروم تمہارا بیٹا ہنسی خوشی کھانے والا ہے۔''

''کیا بکواس کررہی ہو؟'' اس کے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے سودا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میرے بیٹے کا پتہ بتاؤ اور اپنے بیٹے کی زندگی بچاؤ۔ دوسری صورت میں نقصان تم ہی کو اٹھانا پڑے گا میرے پاس تو یوں بھی کھو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔''

''عباس کہاں گیا ہوا ہے؟'' اس نے پیچھے کسی سے پوچھا تھا، اس کی آواز میں پریشانی نمایاں تھی۔

''پتہ نہیں بتا کر نہیں گیا۔'' اس کی بیوی کی مدھم سی آواز ریسیور میں ابھری۔ ''ظفر پلیز

اس عورت کو کسی طرح ٹالو۔''

''تم'' اب وہ مجھ سے مخاطب تھا، پھر ایک ثانیہ خاموشی رہی ''تم سعدیہ ہوناں۔''

''یاد آگیا، اگر تمہاری یادداشت اسی تیزی سے کام کرتی رہی تو عباس کے لئے کوئی گارنٹی نہیں ہے۔''

''بیوقوف احمق عورت جس کے بدلے تم اپنے بیٹے کا سودا کرنا چاہتی ہو وہی تو تمہارا بیٹا ہے۔''

''کیا؟'' مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔

''ہاں عباس تمہارا ہی بیٹا ہے۔''

''لیکن وہ تو انیس شاہ کی بیوی کا بیٹا ہے تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کرسکتے۔'' میں چلائی

''تمہارا یہ جھوٹ عباس کو مرنے سے نہیں بچا سکتا۔''

''مائی گاڈ تم سمجھتی کیوں نہیں، وہ عباس تو سات مہینے کی عمر میں مرگیا تھا۔ خدا کے لئے اپنے پاگل پن میں مزید دیر مت کرو ورنہ ہمارے ساتھ تم بھی ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔''

چند لمحے ریسیور میرے سن ہوتے ہوئے ہاتھوں میں یونہی پڑا رہا۔ پھر میں اسے وہیں پھینک کر دیوانہ وار کوٹھی کی طرف بھاگی باتوں کی آوازیں ڈرائنگ روم سے آرہی تھیں۔

''میں میڈم سعدیہ کو ناپسند نہیں کرتا وہ مجھے ناپسند کرتی ہیں۔'' عباس سوپ پیالے میں نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''بلکہ مجھے تو ان کے ساتھ کسی عجیب انجانے سے تعلق کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے ان کی تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود مجھے اب ان پر غصہ نہیں آتا۔ اس کے برعکس ایک عجیب سی کشش کا احساس ہوتا ہے میں اپنے احساسات بیان نہیں کرسکتا وہ مجھے بری نہیں لگتیں۔''

میں دروازے کے باہر کھڑی اپنے جوان بیٹے کا چہرہ تک رہی تھی، اس کی روشن پیشانی چمکتی ہوئی ذہین آنکھیں اور اس کے خوبصورت ہونٹ مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے کہ میں انہیں اتنا چوموں کہ میری اکیس سالوں کی ساری تشنگی مٹ جائے۔ میں نے تو اپنے خیالوں میں ہمیشہ ایک ننھا منا سا گڈا ہی دیکھا تھا، یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ گڈا اب تک جوان ہوچکا ہوگا۔ میری آنکھوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا وہ ننھا سا گڈا عباس ہے جو اتنا بڑا ہوگیا

ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں جگنو اتر آئے تھے، وہ ہنس پڑا تو ساری کائنات روشن ہوگئی۔

میں نے قدم آگے بڑھائے لیکن ایک بہت بڑے سوالیہ نشان نے میرے قدم وہیں روک دیئے، میں اسے کیسے بتاؤں کہ میں اس کی ماں ہوں؟

وہ ایسے سوال کرے گا جن کے جواب میرے پاس نہیں ہوں گے، میں تو اب تک اپنے مراد کو اسی طرح ننھا منا سا سوچتی آ رہی تھی۔ سفید کمبل میں لپٹا سرخ و سفید مراد۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے اپنے سینے سے لگالوں گی سب سے چھپا کر رکھوں گی۔ اسے ایسی جگہ لے جاؤں گی جہاں اسے ماضی کی یاد دلانے والا کوئی نہ ہو اور وہ میرے پیار کے سائے میں پل کر جوان ہو۔ میرے بے پایاں محبت کے سامنے وہ سب سوال بھول جائے جو وہ زندگی کے کسی بھی لمحے مجھ سے پوچھ سکتا تھا۔

لیکن وہ تو کسی اور کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوگیا تھا، وہ میری محبت کے حصار میں تھا ہی نہیں۔ اسے مجھ سے نہیں ظفر شاہ اور اس کی بیوی سے محبت تھی، مجھے یاد تھا کہ ایک دن اس نے تانیا سے کہا تھا۔

''میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا بہت سے سوال ایسے ہیں جن کے جواب مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن میں نے ان سوالوں کو خود پر مسلط نہیں کیا، بس مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں صرف مما اور بابا سے محبت کرتا ہوں۔ سمندر کی گہرائیوں سے بھی زیادہ محبت، جتنی کورڈیلیا نے اپنے باپ کنگ لیئر سے کی تھی اس سے بھی زیادہ محبت۔''

اس دن مجھے اس کی یہ بات بہت بے ربط لگی تھی، لیکن آج میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ میرے لئے اس کے پاس کیا ہو سکتا تھا سوائے نفرت کے،، ایک ایسی ماں سے وہ نفرت کے علاوہ کیا محسوس کر سکتا تھا۔ جس کے ہوتے ہوئے بھی وہ سات سال تک یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا۔ اس کی زندگی کے سات معصوم سالوں پر وقت نے کتنی بیدردی سے دھول ڈالی تھی۔ ہاں اسے انہی سے محبت کرنی چاہئے تھی جنہوں نے اسے پالا پوسا تھا، اس مقام تک پہنچایا تھا اسے نام دیا تھا شناخت دی تھی۔

میں نے کیا دیا تھا اسے؟ صرف جنم دینے سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو اس رات اس کی

فریاد سن کر اس کی مدد نہیں کر سکی تھی اور اسے اس سرد، تاریک اور سفاک رات کے حوالے کر دیا تھا۔

نہیں میں اپنے جوان بیٹے کا سامنا نہیں کر سکتی تھی، اس کے سوالوں کے جواب میں کوئی اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ زندگی کی روشن راہوں کو اس کے لئے تاریکی میں نہیں بدل سکتی تھی، وہ بمشکل طوفانوں کی زد سے نکلا تھا۔ میں پھر اسے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتی تھی، وہ جو اسے اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ اسے پارہ پارہ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی، محض اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنی ایک لمحے کی خوشی کے لئے میں اس کی ساری زندگی برباد نہیں کر سکتی تھی۔ اچھا تھا کہ اس نے حقیقت کو قبول کرنے کے لئے بار بار اس کی جگالی کرنے کی حماقت نہیں کی تھی اور وہ سب باتیں بھول گیا تھا۔ جنہیں بھلا دینے میں ہی اس کی بہتری تھی اور پھر تانیا کے ڈیڈی بھی تو چاہتے تھے ناں کہ اس کی شادی بہت اچھے خاندان میں ہو۔ ایک ایسے اعلیٰ خاندان میں جس کا رشتہ پا کر ان کے خاندان میں سے کوئی بھی مخالفت کی جرأت نہ کر سکے۔

میرا کیا تھا میں تو یوں بھی تہی دامن تھی، کم از کم اتنی مسرت تو مجھے اب بھی حاصل تھی کہ دور سے ہی سہی میں اسے دیکھ سکتی تھی۔ اس کے چہرے کا ہر رنگ، اس کی آنکھوں کی تمام روشنی، میں تاریک کوریڈور میں کھڑی ایک ٹک عباس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سب سے خوش گپیوں میں مصروف تھا، اس نے سوپ کا پیالہ پرے کر کے کھانے کی پلیٹ اپنی قریب کھسکالی۔

''یہ ٹیسٹ کر کے دیکھو'' تانیا نے ایک ڈش اس کی جانب بڑھائی۔

''لاؤ دو مشروم تو ویسے بھی میرے پسندیدہ ہیں۔''

''آنٹی نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں بہت لذت ہے۔''

عباس نے مشروم اپنی پلیٹ میں نکال لئے اسی وقت جیسے میں ہوش کی دنیا میں پلٹ آئی۔

''عباس!'' میں تیزی سے آگے بڑھی، میری آنکھوں میں وحشت کے سائے لہرا رہے تھے۔

نوالہ اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا اور اس نے حیرت زدہ سی نظروں کے ساتھ دروازے

کی سمت دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر نوالہ گرا دیا، وہ سب دم بخود مجھے دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میرے اردگرد سوالوں کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

''تم نے یہ کھایا تو نہیں؟'' میری آواز اندیشوں سے کانپ رہی تھی۔

''نہیں ابھی تو نہیں۔'' وہ اس ناگہانی افتاد پر حیران تھا ''لیکن ہوا کیا؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں؟''

میں نے شکر گزاری کا گہرا سانس لے کر کرسی تھام لی۔

''آنٹی بات کیا ہے؟'' تانیا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''یہ ان میں۔'' میرا فقرہ بے ربط ہوتا جا رہا تھا ''یہ مشروم زہریلے ہیں۔''

''کیا؟''

''ہاں یہ تم میں سے کوئی بھی نہ کھائے۔'' میں واپس پلٹنے لگی، اس سے عباس کا سامنا کرنا بے حد مشکل تھا۔

''بروقت اطلاع دینے کا شکریہ۔'' عباس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

یہی فقرہ کچھ دیر قبل میں نے جنید سے بھی بولا تھا، ایک لمحے کو میں ٹھٹکی، رکی اور پھر چل دی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر جیسے میں بالکل ہی ڈھے گئی، میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ ہر موڑ پر زیادتی کی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی جان لینے کے درپے ہو گئی تھی، صرف اس لئے کہ وہ انیس کی تصویر تھا اور انیس میرے لئے انتہائی قابلِ نفرت شخص تھا۔ عباس کو دیکھتے ساتھ ہی مجھے انیس کا خیال آ جاتا اور پھر میرے سامنے سے عباس فیڈ آؤٹ ہو جاتا تھا اور اس کی جگہ انیس لے لیتا تھا۔ انیس جو میری تباہی اور بربادی کا ذمہ دار تھا۔ جس نے مجھے تنہائی، کرب اور عذاب کے ایک ایسے ریگزار میں پھینک دیا تھا جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ ایسا طلسم تھا جس میں سالوں کی مسافت طے کر کے جب میں تھکن سے چُور ہو جاتی تھی اور سر اٹھا کر یہ جاننے کی کوشش کرتی تھی کہ اب کتنی مسافت طے ہو گئی اور کتنی رہتی ہے تو وہی منظر پھر پلٹ آتا تھا۔ میں وہیں کھڑی ہوتی تھی جہاں سے میں نے چلنا شروع کیا تھا۔ تب مایوسی

شدت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوتی تھی، لیکن میں ستا نہیں سکتی تھی، تمام تر ہمت مجتمع کر کے پھر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ پھر جدوجہد شروع کر دیتی تھی اور ایک مرتبہ پھر نا کام ہو جاتی تھی۔

ایک ایسے شخص کے لئے میرے دل میں سوائے نفرت کے اور کون سا جذبہ ہو سکتا تھا اور نفرت کی اس عینک کے پیچھے سے جب میں عباس پر نگاہ ڈالتی تو محبت کرنے والی میری تمام حسیں آپ ہی آپ دم توڑ دیتی تھیں۔

قدرت نے مجھ سے عجیب مذاق کیا تھا، اپنی ساری زندگی میں ایک خواب کے پیچھے بھاگتی تھی۔ ایک موہوم سی امید نے مجھے زندگی کا حوصلہ دے رکھا تھا۔ ایک آس تھی جس کی ڈور سے میں بندھی تھی۔

اور اب جب مجھے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی تھی جب امید مجسم ہو کر میرے سامنے آ گئی تھی۔ جب میں ہاتھ بڑھا کر اپنے بیٹے کو چھو سکتی تھی، اسے اپنے گلے سے لگا سکتی تھی۔ تب مصلحت کی بیڑیوں نے مجھے جکڑ لیا تھا، کیا یہ بدنصیبی میرے لئے ہی تھی، آخر ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا تھا مجھ سے جس کی سزا اتنی کڑی اتنی طویل تھی۔

میں بستر پر گر کر رو پڑی، کتنے کچوکے لگائے تھے میں نے اپنے بیٹے کے معصوم اور محروم دل پر۔

''تم یہ بات محسوس نہیں کر سکتیں کیونکہ تم نے ان کی گود کی گرمی دیکھی ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی اس چھوٹی سی بے ضرر بات میں کتنا زہر تھا۔ انہوں نے فہرست سے میرا نام اس طرح کاٹا جیسے تصور میں میرے گلے پر چھری پھیر رہی ہوں۔'' عباس نے تانیا سے کہا تھا۔

''تم نے ان کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں جو مسلسل میرا وجود رد کر رہی تھیں۔'' دیواروں سے عباس کی آواز ابھری۔

''میں نے بچپن سے ہی رویئے اور تاثرات سمجھنے سیکھ لئے تھے، اس لئے میں جس گہرائی میں اترتا ہوں تم لوگ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔'' دیواریں پھر عباس کی آواز میں چیخیں۔

''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا راستہ کوئی تدبیر نہیں روک سکتی۔ گناہ وعذاب کے بیچ

سے پیدا ہونے والا بچہ اپنی پیدائش کو کس تدبیر سے روک سکتا ہے۔ اگر اوپر والا اسے نہ روکنا چاہے تو۔'' میرے لہجے کی حقارت نے خود میرے بیٹے کو چھلنی کر دیا تھا، تبھی تو اس کی آنکھوں میں وہ تلاطم پیدا ہوئے تھے۔ ''یہ میں نے کیا کیا تھا؟''

اور جب ایک مرتبہ عباس نے کہا تھا کہ مجھے رویوں کی پہچان بچپن سے ہی ہو گئی تھی جب۔ اور بات ادھوری چھوڑ دی تھی، تب تانیا نے کس طرح اس سے جرح کی تھی۔

''ہاں ایک لینڈنگ انڈسٹریلسٹ کی ناز و نعم میں پلی ہوئی اولاد جس کے وسیع مکان کی چار دیواری بے حد مضبوط ہے۔ مجھے بتاؤ کہ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے نے بچپن میں رویوں کی پہچان کیسے کی؟''

یا خدا یہ سب کیا ہو رہا تھا عباس کے ساتھ، وہ ان سب کٹیلی اور زہریلی باتوں کا مستحق تو نہیں تھا۔

اور پھر وہ تصویر جو میں نے انیس شاہ کے بیٹے کے ہاتھ کی بنی ہوئی سمجھتے ہوئے عباس کے سامنے پُرزے پُرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں تکلیف اور اذیت کے جو آثار ابھرے تھے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

اسے میرے وجود سے دکھ ہی دکھ ملے تھے، میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی۔

میں نے عباس کو ہمیشہ انیس کے وجود کا حصہ سمجھا تھا اس کی تصویر جانا تھا اور بھول گئی تھی کہ وہ اپنی ذات میں ایک الگ جیتا جاگتا انسان ہے۔ جو شکل میں تو انیس سے مشابہت رکھ سکتا ہے لیکن اس کا وجود اور اس کا ذہن اس کا اپنا ہے۔

کمرے کی ہر دیوار مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، چلا رہی تھی کہ میں نے قدم قدم پر لمحے لمحے اپنے بیٹے کو اذیت اور کرب کے سمندر میں ڈوبنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ قہقہے، سسکیاں، چیخیں، فریادیں اور رونے کی وہ معصوم آواز سب نے مل جل کر مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ ان سب آوازوں سے گھبرا کر میں نے اپنا تکیہ سر پر رکھ لیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا، دیواریں چیخ چیخ کر مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

''تمہیں پتہ نہیں چلتا کہ کب تمہارا دل شفقت سے
اور تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں

شاید اس وقت
جب تمہارے اپنے رازوں کی چیخوں سے
تمہارے کان پھٹ رہے ہوں
کانوں پر تکیہ یا ہاتھ رکھ لینے سے
آوازوں کا شور تو ختم نہیں ہوتا
سوکھے پتے تو ادھ کھلے دروازوں میں سے بھی
اندر آ جاتے ہیں''

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں، جس کے وجود کے پور پور میں عباس کے لئے نفرت بھری ہوئی تھی اب وہی اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''بس دور سے صرف ایک نظر دیکھوں گی اسے۔'' میں نے سوچا اور آنسو پونچھ کر آہستہ قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے انیکسی سے باہر نکل آئی۔ روش پر ہر ایک سیدھی قطار میں کھڑی ہوئی بہت سی گاڑیاں جا چکی تھیں اور ابھی ابھی گیٹ سے کامریڈ کی سیاہ بی ایم ڈبلیو باہر نکل رہی تھی۔ بس ایک گاڑی وہی تھی، عباس کی میٹلک گرے گیلنٹ کھڑی ہوئی تھی۔

''تو عباس کے علاوہ سبھی جا چکے ہیں۔'' میں نے سوچا اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

''میری آنٹی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مجھ سے۔'' ڈرائنگ روم سے تانیا کی چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ ''مجھے بتاؤ ظفر انکل تمہارے کون ہیں اور تمہارے ماما بابا کہاں ہیں؟''

بات کتنی آگے نکل گئی تھی میری غلطی کی وجہ سے۔

''تمہارے لئے میرے وجود کی اہمیت ہے یا مجھ سے منسلک لوگوں کے وجود کی؟''

میری جانب عباس کی پشت تھی اور وہ صوفے کی بیک سائیڈ تھامے اپنے مقابل کھڑی تانیا سے پوچھ رہا تھا۔

''کچھ تو ہے جو آنٹی بار بار مجھے منع کر رہی ہیں، میں سمجھتی تھی کہ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن اب پتہ چلا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ تم اب تک میرے لئے سربستہ راز ہو اور میں تمہاری ذات کی بھول بھلیوں میں گم ہوتی جا رہی ہوں۔ میں نے تمہیں ٹوٹ کر

چاہا ہے عباس، لیکن تم اب بھی مجھ سے میلوں دور کھڑے ہو اپنی ذات میں گم۔ تمہیں صرف اپنے آپ سے دلچسپی ہے میں تمہارے قریب ہوتے ہوئے بھی تم سے بہت دور ہوتی ہوں۔ تم میرے لئے اب بھی بند کتاب کی طرح ہو جس کا میں نے صرف ٹائٹل دیکھ رکھا ہے۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

''کہ تم اپنے بابا کا نام بتاؤ جن کی تم تصویر ہو، شکل میں بھی اور عادتوں میں بھی، ہو بہو سر سے پاؤں تک۔''

''تانیا!'' میں چلا اٹھی، اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

وہ دونوں چونک کر میری طرف پلٹے۔

''آئی ایم سوری بیٹا'' میں نے اپنے آنسوؤں کو بہت مشکل سے پیچھے دھکیلا ''جو کچھ میں نے کہا وہ غلط تھا جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے۔''

''آنٹی!'' صدمے سے تانیا گنگ ہو کر رہ گئی۔

''آپ کیوں میرے راستے میں آ گئی ہیں؟'' عباس کے چہرے پر کرب تھا۔ ''میں نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا پھر کس چیز کا بدلہ لے رہی ہیں آپ؟ میری زندگی میں صرف ایک خوشی آئی تھی وہ بھی آپ نے چھین لی۔ آپ نے مسلسل میرے ساتھ اذیت ناک سلوک کیا، لیکن میں نے اپنے دل میں آپ کے لئے کوئی برائی محسوس نہیں کی۔ پر آج آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ سے نفرت کروں، مجھے شدید نفرت ہے آپ سے۔'' پھر وہ تانیا کی طرف مڑا جو بت بنی کھڑی تھی۔ ''اور تانیا تمہاری آنٹی نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست ہے۔ ظفر علی شاہ میرے بابا نہیں ہیں اور مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ میرا باپ کون ہے؟ مجھے تو یہ بھی معلوم پتا نہیں کہ میری ماں کون ہے؟'' وہ دروازے کی طرف بڑھا اور میرے قریب پہنچ کر رک گیا۔

''امید ہے اب تانیا کو مجھ سے دور کرنے کا آپ کا مقصد پورا ہو گیا ہوگا۔'' اور پھر وہ تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''عباس میری بات سنو'' میں اس کے پیچھے لپکی لیکن تب تک اس کی کار حرکت میں آ چکی تھی، اور بہت تیزی کے ساتھ باہر نکل رہی تھی۔ میں دوڑ کر گیٹ پر پہنچی لیکن تب تک کا

موڑ مڑ چکی تھی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے واپس ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ سوائے بے ترتیب کشنوں اور سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے کے۔ میں پلٹ کر تانیا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بند دروازے پر دباؤ ڈالا لیکن دروازہ لاک تھا۔ میں نے دستک دی، ایک بار، دو بار، تین بار لیکن تانیا نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ بار بار دستک کے جواب میں اس نے پوری آواز کے ساتھ ڈیک کھول دیا۔

میں سر جھکائے انیکسی میں واپس آ گئی۔

ساری بازی ہی اُلٹ گئی تھی، وہ سب ہو گیا تھا جو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ساری رات میں کانٹوں کے بستر پر لوٹتی رہی۔

صبح میں نے فون کر کے ڈیپارٹمنٹ میں اپنے نہ آنے کی اطلاع دی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ گرم گرم چائے کا ایک کپ اور ڈسپرین ہی لے لیتی، اس لئے یونہی کسلمندی سے لیٹی ہوئی تھی۔ دس بجے کے قریب انیکسی کی کال بیل بجی، یہ گھر کا کوئی فرد نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ گھر والے یوں گھنٹی نہیں بجاتے تھے بلکہ دستک دے کر اندر چلے آتے تھے۔ میں اٹھی، صوفے پر پڑا ہوا دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا اور ہاتھوں سے بکھرے بال سنوارتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف چل پڑی۔ وہاں ظفر شاہ اور اس کی بیوی کھڑے تھے۔

''کس لئے آئے ہو تم لوگ؟'' انہیں دیکھ کر میں تمام آداب مہمان نوازی بھول گئی۔

''میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ باتیں یہاں کھڑے ہو کر نہیں کی جا سکتیں۔'' ظفر شاہ میرے چہرے پر ماضی کے خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر راستہ چھوڑ دیا۔

''کیا کہا ہے تم نے میرے بیٹے کو۔'' اس کی بیوی مضطرب تھی اور اس کی سرخ آنکھیں اس کے رت جگے اور رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ ''وہ کل رات سے اپ سیٹ ہے اب تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں تمہیں اس کی زندگی میں زہر گھولنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

میں نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔

''تم چپ رہو اور مجھے بات کرنے دو۔'' ظفر شاہ نے اپنی بیوی کو منع کیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تمہیں یاد ہوگا سعدیہ کہ میں نے تمہیں اپنے آفس میں بیٹیوں کی طرح رکھا تھا۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا مجھے اس کی خبر بہت بعد میں ہوئی تھی۔ اگر جلدی خبر ہو جاتی تب بھی میں شاید میں تمہاری زیادہ مدد نہ کرسکتا لیکن کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرتا۔

تمہارے اچانک آفس چھوڑ جانے سے میں یہی سمجھا تھا کہ تمہیں کہیں اور بہتر جاب مل گئی ہے اور تم یہاں آکر استعفیٰ دینے میں شرمندگی محسوس کر رہی ہو۔ اسی لئے میں نے تمہیں نہ تو کوئی نوٹس بھجوایا اور نہ ہی تمہارا پتا کروایا۔ میں تمہیں آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اور آگے بڑھنے کے لئے اتنی چھوٹی اور بے ضرر قسم کی بے اصولیاں جائز ہوتی ہیں۔ اس روز بھی اگر تم انیس کے پاس جانے کی بجائے میرے پاس آجاتیں تو میں تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔''

''میں وہی کہتی جو انیس شاہ کے گھر کہا تھا تو کیا آپ مان جاتے؟ آپ بھی مجھے اسی طرح دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتے جس طرح آپ کی بیگم اور دوسرے لوگوں نے مجھے نکالا تھا۔'' میرے لہجے میں تلخی اتر آئی گئی۔

''افسوس سعدیہ کہ میں نے تو تمہیں سمجھ لیا لیکن تم مجھے نہیں سمجھ سکیں۔ بہرحال قصور تمہارا بھی نہیں ہے تم بہت چھوٹی تھیں اور تم پر گزرنے والا سانحہ بہت بڑا تھا۔ یقین کرو کہ میں تمہیں دھکے دے کر کبھی نہ نکالتا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تمہارا کردار بے داغ ہے اور کسی بھی قسم کے حالات میں تمہارے قدم غلط راہ پر نہیں اٹھ سکتے اور یہ بھی جانتا تھا کہ انیس کو لڑکیوں کی طرف سے تواضع کی کمی نہیں ہے۔ اس کا کوئی قدم کبھی بھی غلط راہ پر پڑ سکتا تھا لیکن وہ وقت گزر گیا۔

''اس تمام سانحے کا علم مجھے اس دن ہوا جب انیس کا پہلا بیٹا عباس اچانک بلا وجہ بیمار پڑا اور ایک دن میں ہی فوت ہو گیا۔ اس دن انیس کی بیوی نرگس کی بہت بری حالت تھی، اس نے انیس کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ یہ اس لڑکی کی بددعا کا اثر ہے ورنہ عباس بالکل ٹھیک ٹھاک تھا وہ کیسے مر سکتا تھا؟ اس دن سبھی کو کسی نہ کسی حد تک اس بات پر یقین آ گیا تھا کہ تم جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ درست تھا۔

جیسے ہی مجھے اصل بات کی خبر ہوئی میں تمہاری تلاش میں نکلا لیکن جب وہاں پہنچا تو علم ہوا کہ تمہارے ابا جی وفات پا چکے ہیں اور تم اپنی ماں جی کے ساتھ وہاں سے جا چکی ہو، کہاں؟ اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔

انیس کو نرگس نے چھوڑ دیا تھا اسے بہت مان تھا اپنے شوہر پر لیکن انیس نے اس کا مان توڑ دیا تھا۔ ہر طرف سے اس پر لعن طعن ہو رہی تھی ایسے میں ایک دن چپکے سے وہ یہ شہر بلکہ ملک بھی چھوڑ گیا۔ نہ جانے کہاں گیا، کسی کو معلوم نہیں یہ بھی نہیں پتا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔''

ظفر شاہ کی بیوی سر جھکائے ہوئے اپنے آنسو رومال میں جذب کر رہی تھی۔

''اس واقعے کے بہت عرصہ بعد جب ایک دن ہمارے گھر میں ختم قرآن پاک ہو رہا تھا اور یتیم خانے سے بھی کچھ بچے سپارے پڑھنے کے لئے بلائے ہوئے تھے۔ انہی بچوں میں عباس بھی تھا، اس میں اور انیس میں جب وہ سات سال کا تھا ذرا برابر فرق نہیں تھا۔ میری بیگم بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہیں اور انیس سب سے چھوٹا۔ انہوں نے انیس کو اپنے ہاتھوں سے پالا تھا، کزن ہونے کے ناطے میں نے بھی انیس کا بچپن بہت قریب سے دیکھ رکھا تھا۔ ہم نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس بچے کو اپنے پاس لے آئیں گے، پھر گزرتے وقت نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ ہماری نظر نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔''

''اس دن میں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ صرف اس لئے کہا تھا کہ میں تمہیں جھوٹا سمجھ رہی تھی اور انیس میرا سب سے پیارا بھائی تھا۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''مانا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا تھا لیکن اب کوئی بھی تمہارا گزرا ہوا وقت واپس نہیں لا سکتا، تمہاری کسی بھی ضد کا نتیجہ عباس کے لئے بہت برا نکلے گا۔ میں نے اسے پالا ہے اس کی خاطر جتنی راتوں کو میں جاگی ہوں۔ اس کی تربیت پر جس طرح اپنی جان ماری ہے اتنا تو میں نے اپنی سگی اولاد کے لئے بھی نہیں کیا، میں اسے دوسرا انیس نہیں بننے دینا چاہتی تھی۔ میں نے کیا نہیں کیا عباس کے لئے، اسے یتیم خانے کے خوف اور گھر گھر جا کر چندہ مانگنے کی سبکی سے نکالنا کس قدر مشکل تھا یہ تم نہیں جانتیں۔ تم نے اسے صرف پیدا کیا ہے اسے بنایا اور سنوارا میں نے ہے۔ اب جب وہ احساس کمتری کے اس خول سے نکل رہا ہے تو تم اس کی زندگی میں زہر گھولنے آ گئی ہو۔ تمہیں

نہیں پتا وہ بے حد حساس ہے، اس سے اس کا نام اور یہ عزت مت چھینو تم اسے کچھ نہیں دے سکتیں سوائے بدنامی کی کالک کے۔''

میں نے آنکھیں موند کر آنسو پیچھے دھکیلے۔ ''میں اس کی زندگی میں داخل نہیں ہو رہی، میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتی اس کی زندگی سے نکل جاؤں گی میں۔''

''تھینک یو تمہیں اسی سمجھداری کا ثبوت دینا چاہئے۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میرا اس کی زندگی میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میں تو یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ آپ لوگوں کو میرے وجود کی خبر ہو۔''

''سوری لیکن میرا تم سے ملنا بہت ضروری تھا، اس لئے کہ جس طرح تم نے اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کے لئے یتیم خانے کی مدد لی تھی، اسی طرح ہم نے بھی تمہیں تلاش کرنے کے لئے وہیں کا رخ کیا تھا ورنہ میں تمہیں کبھی پہچان نہیں سکتا تھا۔ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔''

ان کے جانے کے بعد کتنی دیر تک میں خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر اپنی سٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھی۔ ٹائپ رائٹر کا ڈھکنا اٹھایا اس میں ایک کاغذ لگایا اور اپنا استعفیٰ ٹائپ کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ٹیلی فون اپنے قریب سرکایا اور امریکن سینٹر میں کام کرنے والی اپنی ایک امریکن دوست کو فون کر کے جلد سے جلد امریکہ کا ویزا دینے کی درخواست کی۔

''بے فکر رہو تمہیں اس کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا بس چند دن کی بات ہے۔''

میں نے فون رکھ دیا۔

ڈیپارٹمنٹ میں استعفیٰ کی خبر سن کر ندرت، صبا، جواد اور کامریڈ مجھ سے ملنے چلے آئے۔

''میڈم آپ نے یوں اچانک استعفیٰ کیوں دے دیا؟'' وہ سراپا سوال تھے۔

''مجھے امریکہ میں زیادہ بہتر جاب کی آفر ہوئی ہے۔'' میں نے ان سے جھوٹ بولا۔

''مجھے معلوم تھا کہ وہاں اچھی جاب کے لئے مجھے تردد نہیں کرنا پڑے گا۔''

''صرف زیادہ اچھی جاب اور امریکی ڈالروں کے پیچھے اگر آپ سبھی تعلیم یافتہ لوگ باہر چلے گئے تو اس ملک کا کیا بنے گا۔'' کامریڈ کو اب بھی انقلاب کی فکر ستا رہی تھی۔

''اسے تم جیسے اچھے لوگ چلائیں گے اور کامریڈ تم مقابلے کا امتحان ضرور دینا لیکن پلیز پرچہ خالی مت چھوڑ آنا۔''

''اور آپ کی وہ تلاش؟'' ندرت نے پوچھا۔ ''کیا وہ تمام ہو گئی؟''

''ہاں'' میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان جذبات سے عاری رکھنے کی کوشش کی۔

''پھر کیا آپ کو اپنی کھوئی ہوئی چیز مل گئی؟''

''ہاں نہ صرف وہ چیز مل گئی بلکہ وہ تو اس قدر قریب ہے کہ ہاتھ بڑھا کر چھو لو اور اتنا دور کہ اتنے بہت سے سالوں کی اڑتی ہوئی گرد میں اسے دیکھنا ناممکن ہو جائے۔''

''تو یہی بات آپ کے واپس جانے کا سبب ہے نا؟'' جواد نے پوچھا۔

''کچھ باتوں کی وجہ نہیں ہوتی بس وہ وقوع پذیر ہو جاتی ہیں اور یا تو انسان کو ابدی مسرتیں دے دیتی ہیں یا پھر اسے بدقسمتی کے صحرا میں بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دیتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہ باتیں وقوع پذیر ہو رہی ہیں میری مرضی کے بغیر۔ اپنے لئے حالات میں خود نہیں بنا رہی یہ بنے بنائے میرے سامنے آ رہے ہیں اور میں انہیں قبول کرتی جا رہی ہوں۔''

''میڈم ہم آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔'' جواد نے دریافت کیا۔

''کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا لیکن تم سب کا شکریہ کہ تم لوگوں نے مجھے یاد رکھا۔''

''آپ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گی۔'' صبا نے مایوسی سے پوچھا۔

''صبا بیٹا جو فیصلہ میں نے کیا ہی نہیں ہے اسے بدلنے کا اختیار بھی میرے پاس کہاں سے آ سکتا ہے؟''

ہم سب کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

''عباس کیسا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''وہ ڈیپارٹمنٹ نہیں آ رہا اب تو بہت دن ہو گئے ہیں اسے دیکھے ہوئے۔'' ندرت بولی۔

''وہ کچھ اپ سیٹ سا لگ رہا تھا۔'' کامریڈ نے کہا۔ ''میں اس کے گھر گیا تھا پتا کرنے معلوم نہیں کیوں اس قدر پریشان تھا۔''

میرا دل درد سے بھر گیا، اب اس کے سوا کوئی چارا نہیں تھا کہ میں اس کی زندگی سے دور بہت دور چلی جاؤں۔ وہ اتنا سمجھدار ہو چکا تھا کہ کچھ عرصے میں اپنے آپ کو سنبھال لے اور زندگی کی شاہراہ پر اعتماد سے قدم رکھ سکے۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد تانیا آ گئی، اس رات کے بعد سے اب تک وہ میرے پاس نہیں آئی تھی۔

''آپ واپس جا رہی ہیں؟''

''ہاں'' میں نے کہا۔

''میری زندگی کی ناؤ کو بھنور سے نکالے بغیر ہی۔'' اس کی آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تھیں۔

''میں شرمندہ ہوں تانیا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا، کاش ایسا نہ ہوتا۔ اگر گزرا ہوا وقت پلٹ سکے تو میں اپنی عمر کے سب باب اپنی کتاب زندگی سے پھاڑ کر ایک نئی کتاب تصنیف کر دوں لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ میرے جانے کے بعد عباس کو منا لینا، اس سے کہنا کہ تمہارے لئے صرف اس کے وجود کی اہمیت ہے باقی سب کچھ بیکار ہے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے تمہاری بات ٹالے گا نہیں۔''

''آنٹی اب تو بتا دیں کہ آپ کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''میں تمہاری زندگی کی ناؤ کو بھنور سے نہیں نکال سکی تو مجھے تمہارے لئے مزید مصیبتیں بھی نہیں کرنی کھڑی چاہئیں۔ بس اتنا یاد رکھو کہ وہ تمہیں بھرپور خوشیاں دے سکتا ہے اسے کھونا نہیں تانیا۔''

''اس کے بارے میں اچانک آپ کا رویہ تبدیل کیوں ہو گیا ہے اور اگر ایسے ہی کرنا تھا تو اتنی دیر کیوں لگا دی، اس وقت جب اسے پانے کی کوئی امید نہ رہی۔''

''میرے جانے کے بعد تمہارے لئے ایک بار پھر سب دروازے کھل جائیں گے۔''

میرے امریکہ جانے کے سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے، ہفتہ کے روز میری فلائٹ

تھی جنید کو خبر ہوئی تو وہ دوڑا آیا۔

''تم نے اتنا اچانک فیصلہ کر لیا ملک چھوڑنے کا؟'' وہ حیران تھا۔

''نہیں اچانک تو نہیں ہے، ہاں میں نے کسی کو بتایا نہیں تھا۔ کس کو بتاتی کوئی اتنا قریبی شخص ہے ہی نہیں جسے میرے آنے یا جانے سے فرق پڑتا۔'' میں نے ہنس کر بات ٹالی۔

''تمہارے قریب اس لئے کوئی نہیں ہے کہ تم نے کسی کو اپنے قریب آنے ہی نہیں دیا۔ تم اپنے گرد ہمیشہ دیواریں تعمیر کرتی رہی، دوری کے حصاروں کو مضبوط کرتی رہی ہو۔ تنہائی کے قلعوں میں بیٹھی رہی ہو اور جو تم تک پہنچنا چاہتے تھے وہ ان دیواروں اور حصاروں کو توڑتے توڑتے تھک گئے ہیں۔ تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے، کتنے برس لاشعوری طور پر میں نے انتظار کیا ہے تمہارا کس لئے؟ صرف اس لئے کہ تم ایک مرتبہ پھر مجھے یونہی چھوڑ کر چلی جاؤ۔''

''جنید جو تم سوچ رہے ہو وہ ممکن نہیں ہے۔''

''تم کس منزل پر ڈیرے ڈالنا چاہتی ہو؟''

میں اسے کیا بتاتی کہ

''منزلیں تو

ادھورے سفر میں آتیں نہیں''

وہ ایک دفعہ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔

اب میں پھر اکیلی تھی اور تنہا ہوتے ہوئے آج پہلی مرتبہ مجھے تنہائی کے احساس نے نہیں ستایا۔ آج عباس کا خیال جگنو کی طرح میری تنہائیوں میں اتر آیا تھا۔ میں اسے دیکھنے دیکھتے رہنے کے لئے تڑپ اٹھی، میں جانتی تھی کہ جب تک یہاں رہی یہ تڑپ ختم نہیں ہو سکتی۔

لیکن وہ تو مجھ سے نفرت کرتا تھا شدید نفرت، میں نے اس کی زندگی میں آنے والی خوشیاں جو چھین لی تھیں۔ مجھے زیادہ کی خواہش نہیں تھی، بس میں صرف یہ چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے، اسے دیکھ لوں۔ آخری مرتبہ اور اس سے معافی مانگ لوں، اس کی زندگی کو ان بحرانوں کا شکار کرنے پر اسے دیکھے بغیر جانا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں نے اس کے گھر کا

نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو۔'' ظفر شاہ کی آواز ابھری۔

''سعدیہ بول رہی ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں کیا بات ہے؟'' ان کے لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''میں کل امریکہ جا رہی ہوں۔'' میں نے انہیں بتایا۔

''تھینک یو!'' وہ واقعی ممنون ہو گئے۔ ''یہ بہت دشوار فیصلہ تھا لیکن اچھا ہوا کہ تم نے کرلیا اس میں سب کی بہتری ہے۔''

''میں ایک مرتبہ اپنے بیٹے سے مل سکتی ہوں؟'' میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سعدیہ، یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔'' وہ مضطرب ہو گئے۔ ''تمہاری ذرا سی جذباتیت سب کچھ ختم کرسکتی ہے۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔'' میں ملتجی لہجے میں بولی۔ ''پلیز آپ یقین کریں میرا میں خود بھی کوئی ایسی حماقت نہیں کرسکتی جس کا خمیازہ میرے بیٹے کو بھگتنا پڑے لیکن ایسا ظلم نہ کریں کہ میں اسے دیکھنے سے بھی محروم رہ جاؤں، کچھ زادِ راہ تو دیں، یوں تہی دامن نہ بھجوائیں پلیز۔'' دو گرم گرم آنسو میرے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

''اچھا آجاؤ۔'' انہوں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ''لیکن یاد رکھنا کہ عباس کوئی اور شاک برداشت نہیں کرسکے گا۔ اس کی زندگی کو طوفانوں کی نذر مت کرنا۔''

میں نے منہ دھو کر ہلکا پھلکا میک اپ کرلیا تاکہ پریشانی اور اداسی کی سب لکیریں میک اپ کے رو پہلے رنگوں میں چھپ جائیں اور کار کی چابی اٹھا کر باہر چلی آئی۔ روش پر صبا کی کار سے ٹیک لگائے عباس کے سوا سب دوست کھڑے تھے۔ تانیا الجھی الجھی اور رنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''تم نے حد سے زیادہ حماقت کا ثبوت دیا ہے اس سے یہ بات کرکے۔'' ندرت اس پر برس رہی تھی۔ ''بھاڑ میں جائیں اس کے ماں باپ تمہیں ان سے کیا لینا دینا۔ تم نے زندگی عباس کے ساتھ گزارنی ہے یا اس کے ماں باپ کے ساتھ۔''

''اسی لئے وہ اتنا اپ سیٹ تھا۔'' جواد پُر خیال انداز میں بولا۔

''لیکن اس تمام بات میں میڈم سعدیہ کہاں فٹ ہوتی ہیں؟'' کامریڈ بولا۔

''مجھے نہیں پتا لیکن میں پاگل ہو جاؤں گی ان حالات میں۔'' تانیا بولی۔

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔'' کامریڈ نے اسے جھڑکا۔ ''ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔''

باتوں کے دوران صبا کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے کھنکھار کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ میں کار کا لاک کھول رہی تھی کہ کامریڈ میرے پاس چلا آیا۔

''میڈم آج آپ ہمیں کچھ وقت دے سکیں گی؟''

''ابھی میں کہیں جا رہی ہوں۔''

''ہم انتظار کرلیں گے۔''

''بعد میں دیکھا جائے گا۔'' میں نے گاڑی سٹارٹ کی۔

اس کا گھر کچھ زیادہ دور نہیں تھا، چند ہی منٹ میں گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ظفر شاہ کی بیوی پریشانی کے عالم میں باہر ہی کھڑی تھی۔

''تم اسے کچھ بتا تو نہیں دو گی؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ میرا بیٹا کبھی نہیں بن سکتا۔''

''اس سے کوئی ایسی بات نہ کہنا کہ اسے ذرا سا شک بھی گزرے۔ وہ میرا سب سے پیارا بیٹا ہے میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ انیس اچھا تھا یا برا لیکن میرا بھائی تھا۔ میں عباس میں بھائی اور بیٹے دونوں کو دیکھتی ہوں، پلیز اسے مجھ سے دور نہ کرنا۔''

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود باہر چلی گئی، تھوڑی دیر بعد عباس اندر داخل ہوا۔ مجھے صوفے پر بیٹھا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گیا۔

''آپ؟ آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟''

''کیا ہم آرام سے بیٹھ کر بات نہیں کرسکتے؟'' میں نے نرمی سے کہا۔

''کچھ باتیں باقی رہتی ہیں کیا؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''بیٹا میں تم سے معافی مانگنے آئی تھی۔''

''کس بات کی معافی؟''

''اب تک جو کچھ ہوا وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا، اسے بھول جاؤ تانیا اب بھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

''بہت خوب!'' وہ تلخی سے ہنسا۔ ''کتنی آسانی سے بری الذمہ ہو گئیں آپ؟ کتنی چھوٹی سی بات ہے یہ آپ کے نزدیک۔ محض ایک ذرا سی غلط فہمی اور بس۔ نہیں میڈم میں آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی اس غلط فہمی کا انجام کس قدر تلخ، کتنا تکلیف دہ ہے۔ اگر آپ کو علم ہوتا تو آپ کبھی یہاں نہ آتیں، معافی مانگنے بھی نہیں۔''

میں نے سر جھکا لیا لیکن میں دکھی ہونے کی حقدار بھی نہیں تھی۔ میں نے اسے جنم دینے کے سوا دیا ہی کیا تھا اگر دینے کے نام پر اس نے مجھے معافی بھی نہیں دی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

باہر کسی قسم کی افراتفری محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے کچھ کام کرنا ہے آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں۔'' عباس کے لہجے میں بے اعتنائی تھی۔

میں ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ وہ واقعی اپ سیٹ تھا اور اس وقت کسی قدر مضطرب اور بے چین بھی لگ رہا تھا۔

باہر کی افراتفری پر شور غالب آتا جا رہا تھا۔

''تم کیوں آ گئے ہو؟ جہاں اتنے عرصے تک اپنی شکل نہیں دکھائی تھی وہاں آج بھی آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم لوگ سب کچھ ختم کر دو گے تباہ کر دو گے۔'' ظفر شاہ کی آواز آئی۔

''پلیز ظفر یہ اتنے عرصے بعد آیا ہے ہم اسے عباس سے نہیں ملنے دیں گے لیکن اسے یوں تو نہ دھتکارو مجھے اسے جی بھر کر دیکھ تو لینے دو۔'' ظفر شاہ کی بیوی رو دینے کو تھی۔

عباس تیزی سے باہر کی طرف بڑھا، میں بھی اس کے پیچھے چل پڑی اور پھر جیسے وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا ویسے ہی میں رک گئی تھی۔ ہمارے سامنے انیس شاہ کھڑا تھا، اکیس سال کی مسافت کی دھول اس کے وجود پر پھیلی ہوئی تھی وہ سر جھکا کر کھڑا ہوا تھا۔ نادم سا پھر بھی اس کا وجود میرے لئے قابلِ نفرت تھا۔ ببول کا درخت اگر جھک جائے تب بھی اس کے

کانٹے قریب سے گزرنے والے ہر شخص کو چھلنی کر دیتے ہیں۔

''میں بہت دور سے آیا ہوں۔'' وہ ہولے سے بولا۔

''آئی ڈیم کیئر۔'' ظفر شاہ چلائے۔ ''تم چاہے جہنم سے آئے ہو یہاں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں عباس کی زندگی میں زہر نہیں گھولنے دے سکتا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور پھر کبھی اپنی شکل مت دکھانا۔''

انیس کو دیکھ کر اکیس سال کی تکلیفوں کے بچھو ایک بار پھر مجھے ڈنک مارنے لگے۔ اذیتوں کے سانپوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے پھن اٹھا لئے۔ یہ شخص میری اور عباس کی تباہی کا ذمہ دار تھا، اس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرا وجود اور میرے سارے رشتے بھی، میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا دوں اور تب تک دباتی رہوں جب تک اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نہ نکل آئیں اور زبان لٹک نہ جائے لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی دروازے میں گم صم کھڑا ہوا عباس قدم قدم آگے بڑھ کر انیس شاہ کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

''عباس تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' ظفر شاہ کی بیوی نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ جما رہا۔

''کون ہو تم؟'' عباس نے انیس شاہ کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

اس کے بعد میرے لئے عباس اور انیس دونوں کا سامنا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اب بات ہم میں سے کسی کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی۔ جو نہیں ہونا چاہئے تھا وہ ہو رہا تھا اور ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ پنڈورا کا پٹارا کھل چکا تھا، زندگی اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ برہنہ ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کے جسم سے رستے ہوئے تمام ناسور ایک ایک کر کے سب کی نظروں میں آنے والے تھے، میں پلٹی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل آئی۔

مجھ میں اس کڑوے سچ کے ساتھ اپنے جوان بیٹے کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا، وہ مجھ سے سوال کرتا تو اسے کیا جواب دیتی۔ میرے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے، اپنی گاڑی صبا کی گاڑی کے پاس کھڑی کر کے میں انیکسی میں چلی آئی۔ میرے آنے کے کچھ ہی دیر بعد

عباس کی گیلنٹ بھی آندھی طوفان کی رفتار سے گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ بریک زوردار آواز سے چرچرائے، دروازہ کھلا اور پھر پورے زور سے بند ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ میرے ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا تھا، اس نے ایک نظر وہیں کھڑے رہتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔

اسے دیکھ کر میں کھڑی ہوگئی۔ ''عباس وہاں کیوں کھڑے ہو یہاں اندر آ جاؤ۔''

''میں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔'' اس نے میری بات نظر انداز کر دی، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ خود پر قابو پانے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔

اب وہ مرحلہ آ گیا تھا جس کے آنے سے میں خوفزدہ تھی۔ وہ مجھ سے پوچھنے آیا تھا کیا؟ یہ میں جانتی تھی لیکن اس کے سوالوں کے جواب دینا میرے لئے موت کو گلے لگانے سے کم نہیں تھا۔

''مجھے بتائیں جب میرے ماں باپ زندہ تھے تو مجھے یتیم خانے کے برآمدے میں کیوں پھینک دیا گیا تھا؟ کیوں اس بات پر مجبور کیا تھا کہ میں چندا لینے کے لئے ایک ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں، بسوں میں بھیک مانگتا پھروں اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے دھتکارا جاؤں؟ جواب دیں مجھے؟''

''تمہیں تمہارے باپ نے کچھ نہیں بتایا؟''

''مجھے صرف میری ماں کا پتا ملا ہے لیکن میں جان کر رہوں گا کہ میری زندگی کیوں تباہ کی گئی، میں تو خود پر اعتماد کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔''

''تمہارے ممی اور بابا نے بھی کچھ نہیں بتایا؟''

''وہ میرے ممی اور بابا نہیں ہیں۔'' وہ چلایا۔

''تمہارے ممی اور بابا وہی ہیں عباس جنم دینا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی، تمہیں بنایا سنوارا انہوں نے ہے۔ پالا پوسا انہوں نے ہے وہی تمہارے ماں باپ ہیں۔''

''تو پھر آپ اور وہ شخص میرے کون ہیں؟ ظفر شاہ اور ان کی بیگم کے بہت احسانات ہیں مجھ پر، لیکن احسان کرنے والے محسن کہلاتے ہیں ماں باپ نہیں بن جاتے۔ انہوں نے مجھے گود لیا تھا مجھے گود سے پھینکنے والا کون تھا؟''

''عباس!'' میں نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں موند کر آنسو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

''پلیز وہ باتیں نہ پوچھو جن کے جاننے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن نقصان سب کو اٹھانا پڑے گا۔''

''صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں وہ اولاد ہوں جو انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہوتی ہیں۔ جو چند لمحوں کے جذباتی تعلق سے وجود میں آتی ہیں اور پھر گناہ کا لیبل بن کر اپنے ماں باپ کے ماتھے پر چسپاں ہو جاتی ہیں۔ اس لئے عقل مند مائیں ایسی اولاد کو رات کی تاریکی میں کہیں کچرے کے ڈھیر پر یا سڑک کے کنارے ڈال جاتی ہیں۔ آپ ذرا رحمدل تھیں اس لئے یتیم خانے کے برآمدے میں ڈال آئیں۔''

''خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔'' مجھ میں اب برداشت کی اور تاب نہیں تھی۔ ''تم بالکل معصوم ہو کسی گناہ کا لیبل نہیں ہو تم کیونکہ یہ گناہ تم سے سرزد نہیں ہوا۔ اس دنیا میں آنے کا قصور تم نے نہیں کیا تھا تم تو لائے گئے تھے۔ اپنی مرضی اور خوشی کے بغیر، اس گناہ میں تمہارا کوئی حصہ نہیں تھا۔''

''تو پھر سزا مجھے کیوں ملی؟ ایسا جذباتی تعلق کیوں جوڑا آپ لوگوں نے؟''

وہ بار بار الفاظ کے نشتر چبھو رہا تھا اس کے لفظوں میں میرے لئے تحقیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں اس کی نظروں سے گر کر پاؤں کی دھول ہو چکی تھی، اُف اپنے جوان بیٹے کو حقیقت بتانا کس قدر تکلیف دہ کتنا اذیت ناک تھا۔ وہ میرے مقابل کھڑا تھا میں نے اس کی جانب پشت کر لی، میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

''میرے بیٹے وہ جذباتی تعلق نہیں تھا وہ مرد اور عورت کا ایسا تعلق تھا جس میں عورت بہت کمزور اور مرد بہت قوی ہوتا ہے۔''

چند ثانیے سناٹا طاری رہا، اتنی خاموشی کہ میں اپنے دل کی خفیف سی دھڑکن بھی بخوبی سن سکتی تھی۔ پھر اس نے سختی سے میرے کندھوں کو پکڑا اور میرا رخ موڑ دیا، کچھ لمحوں تک وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ''نہیں نہیں۔''

اور پھر مڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر گیلری میں تانیا اور اس کے سب

دوست آنکھیں پھاڑے اُڑی ہوئی رنگت کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ عباس ان کے درمیان سے بھی نکل گیا، اسے کار کی طرف بڑھتے دیکھ کر تانیا چلائی۔

''عباس رکو۔''

لیکن وہ رکا نہیں۔

''کامریڈ، جواد پلیز عباس کو روکو اس وقت اس کا ڈرائیونگ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ دونوں عباس کی طرف بھاگے جو گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا۔

''عباس ٹھہرو۔'' کامریڈ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہیں آج میں سب کچھ ختم کر دوں گا اس ذلیل انسان کو بھی اور خود کو بھی۔'' عباس نے خود کو چھڑایا لیکن کامریڈ اور جواد دونوں نے اسے پھر پکڑ لیا۔

''مجھے نفرت ہے ہر چیز سے، خود سے اپنے ماں باپ سے، اس زمین و آسمان سے اور اس کے درمیان نظر آنے والی ہر چیز سے۔'' وہ چلا رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ ''سب چیزیں سب لوگ قابلِ نفرت ہیں۔ میرے اپنے وجود سمیت چھوڑ دو مجھے، مجھے اس ذلیل کمینے شخص سے ایک ایک لمحے کا حساب لینا ہے۔ ایک ایک تکلیف ایک ایک اذیت کا بدلہ لینا ہے، چھوڑ دو مجھے۔''

اور پھر خود کو چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ کامریڈ کے کاندھے سے سر ٹکا کر رو پڑا۔

''یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہوا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''ریلیکس عباس۔'' وہ عباس کو مرکزی مکان کی طرف لے گیا، گیلری میں بت بنی تانیا بھی ان کے پیچھے دوڑی، ندرت اور صبا بھی آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس سمت بڑھ گئیں۔

میں وہیں صوفے پر ڈھے گئی، دکھ کی ایک لہر اٹھی اور میرے وجود میں بھر گئی۔ آج اپنے جوان بیٹے کے سامنے میں جس امتحان جس عذاب سے گزری تھی وہ ان اکیس طویل سالوں کی سب اذیتوں سے بڑھ کر تھا۔ پہلے تو امید تھی آس تھی پھر وہ آس مجسم ہو گئی گو کہ وہ میرے قبضہ اختیار میں نہیں تھی لیکن یہ احساس تو تھا کہ کہیں کوئی میرا اپنا ہے لیکن اب نہ آس تھی نہ احساس۔ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا تھا، ایک مرتبہ مجھے ہوس نے ڈسا تھا اور اب نفرت نے

مجھے راکھ کر دیا تھا۔ اب کیا امریکہ، کیا پاکستان اور کیا یورپ کہاں جاتی؟ کس امید پر جیتی؟ نفرت کے کانٹوں کے سوا عباس کے پاس میرے لئے اور تھا ہی کیا۔ اب زندگی اور موت دونوں کا وجود میرے لئے بے معنی ہو گیا تھا۔

میں انیکسی سے نکل کر مرکزی مکان کی طرف چل دی۔ اپنے عباس کو دیکھنے کے لئے، وہ سب تانیا کے کمرے میں تھے اور دروازہ بند تھا۔

''پلیز عباس پانی تو پی لو۔'' تانیا کی آواز آ رہی تھی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے میں ٹھیک ہوں۔'' عباس کہہ رہا تھا۔

''اس کی ضرورت ہے۔'' جواد نے اسے ڈپٹا۔

''تانیا میں نے فیصلہ کر لیا ہے بتاؤ تم میرا ساتھ دو گی؟'' عباس نے کہا۔

''یہ باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں پہلے تم......''

''یہ باتیں ابھی ہوں گی۔'' عباس نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ ابھی میں کس مقام پر کھڑا ہوں؟''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''یعنی تم میرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔''

''نہیں عباس یہ بات نہیں ہے۔'' تانیا جلدی سے بولی۔ ''بات یہ ہے کہ ہم لڑکیاں اس قسم کے فیصلے اکیلے نہیں کیا کرتیں۔''

''بات تو وہی ہوئی تمہارے ڈیڈی تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''کیوں نہیں دیں گے یار ہم کس لئے ہیں ہم ان سے کہیں گے ان پر دباؤ ڈالیں گے۔'' کامریڈ کی آواز آئی۔

''عباس اس وقت تم ان باتوں کو ذہن پر مت سوار کرو۔'' صبا نے کہا۔

''For Heavens Sake اس وقت مجھے تانیا سے بات کر لینے دو۔'' عباس چڑ گیا۔ ''تانیا تم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہو گی؟''

''میں اس حد تک تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں کہ ڈیڈی کے نہ ماننے کی صورت میں ان

کے کسی تجویز کردہ نام کو بھی رد کر دوں کیونکہ میں تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتی لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ ڈیڈی کو راضی کئے بغیر میں کچھ نہیں کروں گی، مجھے کسی صورت ان کی عزت پر حرف لانا منظور نہیں ہے۔ اگر مجھے اپنی مرضی چلانی ہوتی تو اس وقت آنٹی کی ناراضگی کی بھی پرواہ نہ کرتی لیکن میں یہ چاہتی تھی کہ میری ذات سے ان لوگوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے جن سے میں محبت کرتی ہوں اور جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ تم صحیح راستے سے آؤ گے تو میں ڈیڈی کو قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گی لیکن میں سول میرج قسم کی کوئی چیز نہیں کر سکتی۔''

''ہاں تمہیں یہی کرنا چاہئے۔'' عباس بولا۔

''یار ہم کس لئے ہیں تمہیں ہم پر بھروسا نہیں ہے۔'' جواد نے کہا۔

''مجھے خود پر بھی بھروسا نہیں رہا۔'' عباس کی مدھم سی آواز آئی۔ ''اس ایک انسان کی کمینگی نے......'' وہ خود ہی چپ ہو گیا۔

''دفع کرو تمہارے سامنے اتنی لمبی زندگی ہے اسے اپنے لئے بہتر بناؤ۔'' ندرت بولی۔

''میں چلتا ہوں اب۔''

''پلیز عباس ابھی مت جاؤ۔'' تانیا کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''جواد اسے منع کرو نا یہ اسے دیکھ کر ہی پاگل ہو جائے گا اور کچھ کر بیٹھے گا۔''

میں بند دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی، دروازہ کھولنے کی میرے اندر ہمت نہیں تھی اس لئے تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ آئی۔

میری وجہ سے میرا بیٹا تہی دامن رہ گیا تھا، سب کچھ اس سے چھن گیا تھا۔ اس کی محبت اس کی شناخت اس کی خوشیاں کتنی بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں، یہ زندگی بھی کچھ۔ میں نے اٹھ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے خواب آور دوا کی شیشی نکال لی، جو میری تنہائی کی راتوں کی ساتھی تھی۔ شیشی سے تمام گولیاں نکال کر میں نے اپنے ہاتھ پر رکھ لیں اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

مجھے وداع کر
اے میری ذات پھر مجھے وداع کر
میں تیرے ساتھ

اپنے آپ کے سیاہ غار میں
بہت پناہ لے چکا
میں اپنے ہاتھ پاؤں
دل کی آگ میں تپا چکا
مجھے وداع کر
کہ اپنے آپ میں
میں اتنے خواب جی چکا
کہ حوصلہ نہیں
میں اتنی بار اپنے زخم سی چکا
کہ حوصلہ نہیں''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

تمام گولیاں ایک ہی مرتبہ حلق سے نیچے اتارنے کے لئے میں نے اپنا ہاتھ بلند کیا، لیکن درمیان میں ہی میری کلائی کو کسی نے سختی سے جکڑ لیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں میرے سامنے عباس کھڑا ہوا تھا۔

''عباس!'' میں زیرلب بولی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟'' اس نے گولیاں میرے ہاتھ سے لے کر نیچے قالین پر پھینک دیں۔ ''انتظار کے اتنے طویل اور کڑے سال میں نے اس لئے گزارے تھے کہ کیا اپنی ماں کو پا کر میں پھر کھو دوں۔''

''ماں'' میرے کانوں میں اس کی آواز گونجنے لگی اور میرے سارے وجود میں جیسے بوند بوند امرت اتر گیا۔

''تم یہاں اس وقت کیوں آئے عباس؟ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' میں نے قالین پر بکھری ہوئی گولیوں کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہیں کرنا چاہئے تھا میری ماں میرے سامنے جان دے رہی تھی اور پھر بھی مجھے کچھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''میں تمہارے لئے زندگی کی راہیں اور خار زار نہیں بنانا چاہتی۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی، کوئی خوشی کوئی مسرت نہیں جاؤ اپنے ممی بابا کے پاس چلے جاؤ۔''

''ہم دونوں دکھوں کے طویل صحرا عبور کر کے اب اکیس سال بعد ملے ہیں کیسے چھوڑ جاؤں میں آپ کو۔''

''جذباتی باتیں مت کرو تمہیں ایک نام کی ضرورت ہے عباس اور ماں اولاد کو سب کچھ دے سکتی ہے اپنا نام نہیں دے سکتی۔''

''نہیں چاہئے مجھے اس ننگِ انسانیت اور ذلیل شخص کا نام جو میری بدقسمتی کی وجہ سے میرا باپ ہے۔ ممی مجھے نام کی نہیں اپنی ماں کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو مزید بھٹکنے کے لئے بھیڑیوں کے اس جنگل میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا، ہم دونوں مل کر ہر آندھی ہر طوفان کا مقابلہ کریں گے۔''

میں نے اپنے سامنے کھڑے عباس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر عزم اور لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ اس کا ہر انداز اعتماد سے بھرپور تھا۔ وہ مجھے چھاؤں دے سکتا تھا، میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور رو پڑی۔ اس نے مجھے سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بھی آبدیدہ تھا، کتنی دیر تک ہم آنسوؤں کی زبان میں ایک دوسرے کے دکھ بانٹتے رہے۔

''میں آپ کا بیٹا ہوں صرف اور صرف آپ کا بیٹا آپ کا عباس۔'' اس کی آواز شہد کی طرح میری سماعت میں اتر رہی تھی۔

''عباس یہ دنیا تمہارا جینا مشکل کر دے گی۔ تمہارے راستے کی ساری روشنیاں گل کر دی جائیں گی۔ تمہارا وجود قابلِ نفرت قرار دیا جائے گا، تمہاری محبت تم سے چھین لی جائے گی۔''

''میں ہر امتحان سے گزروں گا ہر رکاوٹ عبور کروں گا، اتنا حوصلہ ہے مجھ میں اب اس معاشرے کو بدلنا ہوگا۔ ان سب قاعدے اور قوانین کو بدلنا ہوگا جو انسان کی ذات کی بحیثیت انسان نفی کرتے ہیں۔ جو بے گناہوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں، جو انسان کو انسانیت کے درجے سے نیچے گرا دیتے ہیں۔ ممی ہم بے گناہ ہیں تو اس معاشرے کا

عفریت ہمیں کیوں نگلے۔ آج ہم خاموش ہو کر الگ ہو گئے تو نہ صرف ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے بلکہ یہ تہذیب انسانی کی بھی موت ہوگی۔ ہمیں اپنا حق لینا ہے، اس سارے معاشرے سے جو خطا مجھ سے اور آپ سے سرزد نہیں ہوئی، اس کی سزا ہم کیوں ساری زندگی بھگتتے رہیں۔''

اس نے میری آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھے۔

''ممی میں اکیس سال سے آپ کو پانے کے لئے تڑپتا رہا ہوں، مجھے انکل ظفر کے گھرانے نے بہت محبت دی تھی۔ میرے لئے وہ سب ہمیشہ محترم رہیں گے مجھے اب بھی ان سے بہت پیار ہے لیکن آپ کی محبت کا نعم البدل کوئی نہیں ہو سکتا، میں بہت تڑپا ہوں آپ کے لمس کے لئے، آج مجھے پیار نہیں دیں گی کیا؟''

میں بھی تو برسوں اس کے لمس کے لئے ترسی تھی، میں نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ ساری زندگی بھٹکنے کے بعد آج کتنی ٹھنڈی چھاؤں ملی تھی مجھے۔ میں اس طلسم کی قید سے آزاد ہو گئی تھی، جس میں چلتے چلتے میرے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے، میں نے پُرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆======ختم شد======☆